بسم اللہ الرحمن الرحیم

محمود، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید سیریز ۶۹

چوتھا ٹکڑا

اشتیاق احمد

دو باتیں

چوتھا ٹکڑا ایک عجیب سا ناول ہے۔ آپ اسے غریب سا بھی کہہ سکتے ہیں اور کہنے کا کیا ہے، کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ جہاں تک کہ چوں چوں کا مربہ بھی؛ تاہم چوں چوں کا مربہ کہنے سے پہلے آپ یہ سوچ لیجیے گا کہ اس قسم کا کیس انسپکٹر جمشید، محمود، فاروق اور فرزانہ کو آج تک حل کرنے کے لیے نہیں ملا ہوگا، جس میں آخری لمحے تک وہ مجرم کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکے، کوئی رائے قائم نہیں کر سکے۔ ہاں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ محمود، فاروق اور فرزانہ کو اس مرتبہ زیادہ کام کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اب کیا کیا جائے۔ حالات کے مطابق ہی کام کیا جا سکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ حالات نے اس مرتبہ انسپکٹر جمشید کو بھی کام کرنے کا موقع نہیں دیا۔ وہ بھی مجبور ہو کر رہ گئے۔ ایک ذہین مجرم نے سبھی کو چکرا کر رکھ دیا، لہٰذا ان خاص حالات کی بنا پر تو آپ اس ناول کو پسند کرتے ہی نظر آئیں گے۔ میرا خیال تو یہی ہے۔ اندازہ بھی یہی ہے۔ آگے جو خدا کو منظور۔

اشتیاق احمد

طابع : اشتیاق احمد [illegible]
مطبع : زاہد بشیر پرنٹرز لاہور
خوشنویس : محمد عبدالستار [illegible]
قیمت : 6.50

مکتبہ اشتیاق راجپوت مارکیٹ اردو بازار، لاہور

ترتیب

انتساب

سید علی وصی کے نام ۔۔
اس کہانی کا مرکزی خیال انہوں نے مرحمت فرمایا۔۔

دادا جان کا خط

انسپکٹر جمشید ایک خط پڑھ رہے تھے۔ خط شام کی ڈاک سے آیا تھا۔ وہ اس خط میں اس طرح گم تھے، جیسے کوئی دلچسپ ناول شروع کر دیا ہو ۔۔ ان کی چائے میز پر رکھی رکھی ٹھنڈی ہو چکی تھی ۔۔ خط کافی طویل تھا۔ جب سے انہوں نے پڑھنا شروع کیا تھا، ایک بار بھی اس سے نظریں نہیں ہٹائی تھیں ۔۔ محمود، فاروق، فرزانہ اور بیگم جمشید حیران تھے کہ یہ کس کا خط آ گیا ۔۔ خدا خدا کر کے انہوں نے خط ختم کیا۔ اسے تہہ کیا اور میز پر رکھ کر چائے کے کپ کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان کی عادت تھی کہ ایک بار چائے ٹھنڈی ہو جائے تو اسے گرم نہیں کراتے تھے، یا تو چائے دوبارا بنتی یا پھر ٹھنڈی چائے ہی پی لیتے ۔۔ چنانچہ اس وقت بھی انہوں نے چائے کا کپ اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔

" دوسری بناؤں ؟" بیگم جمشید نے پوچھا۔

" نہیں، یہی ٹھیک ہے ۔" وہ بولے۔

" آپ بتائیں گے نہیں ؟" محمود بولا ۔۔ اس کی نظریں خط کی

طرف اُٹھ گئیں۔

"یہ خط تمہارے دادا جان کا ہے" وہ مسکرائے۔

"جی، دادا جان کا خط۔ لیکن ہمارے دادا جان کا تو ہماری پیدائش سے بھی پہلے انتقال ہو گیا تھا۔" فرزانہ نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں، یہ ٹھیک ہے۔ لیکن ان کے دوست ابھی تک زندہ ہیں۔ والد صاحب کے بچپن کے دوست۔ ظاہر ہے، تم انہیں بھی دادا جان ہی کہہ سکتے ہو۔"

"ضرور کہہ سکتے ہیں اور یہ جان کر خوشی بھی ہوئی کہ ہمیں بیٹھے بٹھائے ایک عدد دادا جان مل گئے۔" فاروق نے واقعی خوش ہو کر کہا۔

"لیکن اس خط میں ہے کیا؟ آپ نے بہت دلچسپی سے پڑھا ہے اسے۔" بیگم جمشید سے بھی رہا نہ گیا۔

"بھئی زیادہ بے چین ہونے کی ضرورت نہیں۔ لو تم لوگ بھی اسے پڑھ لو۔ تمہارے دادا جان نے تمہیں اپنے گاؤں آنے کی دعوت دی ہے۔"

"تو دادا جان گاؤں میں رہتے ہیں؟" محمود بولا۔

"ہاں، وہاں ان کی بے شمار زمینیں ہیں، لیکن ان کا گاؤں یہاں سے بہت دُور ہے اور ہے بھی بہت پر اسرار علاقہ۔"

"پر اسرار علاقہ، کیا مطلب؟"

"اس گاؤں کے شمال میں بہت پرانے کھنڈرات ہیں۔ اتنے پرانے کہ اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا۔ ماہرینِ آثارِ قدیمہ بھی ان کھنڈرات کے بارے میں کچھ اندازہ نہیں لگا سکے۔ میں جب بھی نواب انکل سے ملنے گیا، ان کھنڈرات کی ضرور سیر کی۔"

"لیکن آپ نے پہلے کبھی دادا جان، ان کے گاؤں اور کھنڈرات کے بارے میں کبھی ذکر نہیں کیا۔" فرزانہ کے لہجے میں شکایت تھی۔

"اس لیے نہیں کیا تھا کہ تم پر وہاں جانے کا بھوت سوار ہو جائے گا۔" وہ مسکرائے۔

"تو کیا یہ خط پڑھ کر بھوت سوار نہیں ہو گا۔" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

"اب اس بھوت کے سوار ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"جی کیا مطلب؟" وہ چونکے۔

"خط پڑھ لو، خود ہی جان لو گے۔"

انہوں نے خط کھولا اور چاروں ایک ساتھ اس پر جھک گئے، خیریت گزری کہ سر آپس میں نہیں ٹکرائے۔

خط کے الفاظ یہ تھے:

"عزیزم جمشید،

ایک زمانہ گزرا، جب تم قصبہ رومان چند آئے تھے۔ اس کے

بعد تم نے میری خبر نہیں لی ؛ حالاں کہ تم مجھے نواب انکل
کہتے ہو ۔ کیا اپنے نواب انکل کو بالکل بھول گئے ۔۔ میں نے تو
اس خیال سے خط نہیں لکھا کہ نہ جانے تم کس قدر مصروف
ہو گے ۔ خدا کرے تم خیریت سے ہو ۔۔ تم نے کبھی اپنے بچوں
سے بھی نہیں ملوایا ۔۔ سننے میں آیا ہے ' وہ بھی تمہارے نقشِ
قدم پر چل نکلے ہیں اور خوب جاسوسی بگھارتے ہیں ۔۔ اس
طرف کا اخبار یہاں بہت کم آتا ہے ۔ جب بھی آتا ہے ' ضرور
خریدتا ہوں اور اگر اس میں آپ لوگوں کا کوئی کارنامہ ہوتا
ہے ' تو پڑھتا ہوں ۔ اتنے شوق سے تو میں نے کبھی ناول
بھی نہیں پڑھے ۔۔ تم تو جانتے ہی ہو ' مجھے ناولوں وغیرہ کا
کوئی شوق نہیں ۔۔ شوق رہا ہے تو بس ایک ' اور وہ شکار
کا ۔۔ اللہ تمہارے والد کی مغفرت فرمائے ۔۔ وہ بھی بہت
اچھے شکاری تھے ' لیکن شکار کے لیے نکلتے کبھی کبھار ہی ۔۔
جب بھی نکلتے میرے ساتھ ؛ ورنہ نہیں ۔۔ ہاں تو میں آپ
لوگوں کے کارنامے ضرور پڑھتا ہوں ' جب بھی پڑھنے کو مل
جائیں ۔۔ محمود ' فاروق ' فرزانہ اور ان کی امی سے ملنے کو بہت
جی چاہتا ہے ۔۔ اس سے پہلے کبھی اس لیے نہیں لکھا کہ نہ
جانے تم کتنے مصروف ہو گے ۔ آنا پسند بھی کرو گے یا نہیں ؛
لیکن اب میں تمہیں یہاں آنے کی دعوت دینے پر اس حد تک

مجبور ہو گیا ہوں کہ یہ خط لکھے بغیر کسی طرح نہ رہ سکا ۔۔
سنو جمشید ' جوں ہی تمہیں یہ خط ملے ' قصبہ رومان چند آ جاؤ ۔
کیونکہ میں بہت پریشان ہوں ' اتنا کہ زندگی میں کبھی نہیں
ہوا ہوں گا ۔ تم یہ پڑھ کر حیران ہوتے ہو گے ' کیونکہ مجھ
جیسے آدمی کو جسے اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی نعمتوں سے نوازا
ہے ' کسی چیز کی کوئی کمی نہیں ۔۔ خدا نے عبادت کا شوق بھی
دیا ہے ' بھلا کیا پریشانی ہو سکتی ہے ۔۔ گناہوں سے بھی بچے
رہنے کی کوشش کرتا ہوں ۔۔

ان حالات کے باوجود ان دنوں بہت پریشان ہوں ۔
پریشانی کی وجہ خط میں تحریر نہیں کر رہا ' یہاں آنے پر
بتاؤں گا ۔۔ میں نے تمہیں گول مول لکھا ہے ۔ امید ہے کہ
تم میری بات نہیں ٹالو گے اور خط ملتے ہی ادھر کے
لیے روانہ ہو جاؤ گے ۔۔ تم یہ بھی خیال نہ کرنا کہ میں نے
سوچے سمجھے بغیر ہی تمہیں بلانے کا پروگرام بنا لیا ہے ۔
پہلے میں نے قصبے کے پولیس آفیسر جہاں خان کی مدد حاصل
کی تھی ' لیکن بعد میں میں نے محسوس کیا کہ یہ معاملہ ان
کے بس کا روگ نہیں ہے ؛ چنانچہ تمہیں خط لکھنے پر خود
کو مجبور پایا ۔۔ یوں لگتا ہے ' جیسے اس عمر میں مجھے پریشانیوں
نے اپنے شکنجے میں لے لیا ہے ۔ آؤ اور اس شکنجے سے مجھے

نجات دلا دو۔ ان دنوں کو یاد کر کے ہی آ جاؤ، جو تم
نے میرے ساتھ گزارے، یعنی اپنے بچپن کے دن جب
تم بارہ تیرہ سال کے لڑکے تھے اور قصبے کے کھنڈرات
میں گھنٹوں گزارا کرتے تھے۔ ادھر ادھر کی ہر چیز کو غور
سے دیکھا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے، یہ کھنڈرات نہ جانے
کیوں مجھے بہت پراسرار لگتے ہیں۔ یوں سمجھ لو کہ آج تمہیں
میں نہیں، وہ کھنڈرات بلا رہے ہیں۔

اور اگر کسی وجہ سے نہ آ سکو تو ایک خط ضرور لکھ دینا
تاکہ تمہارا بوڑھا انکل انتظار ہی نہ کرتا رہ جائے۔ اس کی
آنکھیں ہی نہ پتھرا جائیں۔ اس خط کو پوسٹ کرانے کے بعد
سے میں ہر صبح تمہارا انتظار شروع کیا کروں گا اور رات گئے
تک انتظار کی شمع جلائے رکھا کروں گا۔

فقط تمہارا انکل

نواب فخر الدین یار خان"

خط ختم کر کے انہوں نے اپنے سر اٹھائے۔ وہ خط میں اس
طرح گم ہو گئے تھے کہ ایک بار بھی اس سے نظریں نہیں ہٹا سکے تھے۔

"واقعی ابا جان خط بہت ہی دل چسپ ہے۔ لکھنے کا انداز ایسا
ہے کہ آدمی ڈوب جاتا ہے تحریر میں۔ خط کے آخری الفاظ سے
ظاہر ہے کہ وہ کسی چکر میں پھنس گئے ہیں، ورنہ انہیں علاقے کے پولیس

آفیسر سے کیوں مدد لینا پڑتی، لیکن جب ان کی مدد سے بھی دادا
جان کی پریشانی دور نہ ہوئی تو وہ آپ کو خط لکھنے پر مجبور ہو گئے۔"
محمود کہتا چلا گیا۔

"ہاں، یہ ٹھیک ہے اور اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ
ہم وہاں جائیں گے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"واہ، مزا آ گیا ہے۔ بھلا اس سے اچھا فیصلہ اور کیا ہو سکتا
ہے۔ موسم سرما کی چھٹیوں کا لطف آ جائے گا۔" فرزانہ چہکی۔

"تمہیں تو ہر وقت لطف کی پڑی رہتی ہے۔ بھئی ہم وہاں
نواب دادا کی پریشانی دور کرنے جا رہے ہیں، نہ کہ سیر کرنے۔"
فاروق نے منہ بنایا۔

"پریشانی دور کرنے کے ساتھ ساتھ اگر ہم سیر بھی کر لیں
اور وہ بھی کھنڈرات کی سیر ــــ اور وہ بھی ان کھنڈرات کی جو ابا
جان کو بھی بچپن میں پراسرار لگا کرتے تھے، تو کیا حرج ہے۔"

"کوئی اور اور وہ بھی نہیں بچا۔" فاروق نے ہنس کر کہا۔

"اگر تم نے لڑنا شروع کر دیا تو جانے کی تیاری نہیں کر سکو
گے۔ جب کہ میں کل صبح سویرے نکل جانا چاہتا ہوں۔ یہاں سے
ہمیں جہاز پر جانا پڑے گا، پھر گاڑی کا سفر کرنا پڑے گا اور اس
کے بعد کسی تانگے کا۔" انہوں نے بتایا۔

"اوہو، ایک ٹکٹ میں تین مزے۔" فاروق مسکرایا۔

"نہیں، تین ٹکٹ میں تین مزے — ہر چیز کا الگ ٹکٹ لینا پڑے گا۔" فرزانہ نے اسے گھورا۔

"میں تو چلا تیاری کرنے — تم دونوں جب لڑ بھڑ کر فارغ ہو جاؤ تو تیاری کرنے کے لیے آ جانا۔" محمود نے جھلا کر کہا، اور اٹھ کھڑا ہوا۔

دوسری صبح وہ جہاز میں بیٹھ چکے تھے — جہاز کا سفر صرف دو گھنٹے کا تھا، لیکن اس کے بعد گاڑی میں انہیں چار گھنٹے گزارنا پڑے اور پھر سٹیشن سے اتر کر ایک تانگے میں بیٹھنا پڑا۔ تانگے نے انہیں تقریباً ایک گھنٹے بعد نواب فخرالدین یار خان کی حویلی کے سامنے اتار دیا — حویلی کیا تھی، ایک چھوٹا سا محل تھا، جس کے چاروں طرف ایک ہرا بھرا باغ تھا — چاروں طرف سے باغ کے اندر گھری حویلی اداس سی لگ رہی تھی۔ باغ کا پھاٹک کھلا تھا، اس کھلے باغ سے گزر کر وہ اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے نواب صاحب کو تار بھی نہیں دیا تھا۔ صرف اس خیال سے کہ کہیں وہ انہیں لینے سٹیشن تک نہ آ جائیں، لہذا ان کا استقبال کرنے کے لیے دروازے پر بھلا کون موجود ہوتا —

"کتنا خوب صورت باغ ہے۔ جی چاہتا ہے، یہیں پڑ رہوں۔" فرزانہ نے سرد آہ بھری۔

"لیکن یہاں تمہیں کیس نہیں ملیں گے۔ جاسوسی چکر گلے نہیں

پڑیں گے۔" محمود نے جواب دیا۔

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ اب تو میں بھی یہی خواہش کروں گا۔ کاش، میں بھی یہیں رہنا شروع کر دوں۔"

"بھئی، تم اس ماحول کا ساتھ نہیں دے سکو گے۔ چند دن تو ضرور گزار لو گے، پھر تمہیں شہر کی مصروفیات یاد آنے لگیں گی۔ یہ باغ، یہ حویلی، اس قصبے کے کھنڈرات سب تمہیں کاٹ کھانے کو دوڑنے لگیں گے اور تم شہر کی طرف بھاگ کھڑے ہو گے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"لیکن ابا جان، بھاگتے بھاگتے تو ہم وہاں نہیں پہنچ پائیں گے۔"

"دھت تیرے کی — کبھی جو یہ شخص کوئی سنجیدہ بات بھی کہہ دیا کرے۔" محمود نے جھلا کر ران پر ہاتھ مارا۔

اچانک ایک تیز چیخ ان کے کانوں سے ٹکرائی، پھر حویلی کا ایک دروازہ کھلا اور ایک نوجوان لڑکی بدحواسی کے عالم میں دوڑتی باہر آئی — وہ اندھا دھند دوڑ رہی تھی۔ یہاں تک کہ محمود سے آ ٹکرائی —

"ارے ارے، محترمہ، یہ کیا معاملہ ہے؟" محمود ہکلایا۔

"وہ، وہ، اندر جانی ۔۔" لڑکی ہکلائی۔

"وہ، وہ، اندر جانی ۔۔ بھلا اس کا کیا مطلب ہوا" فاروق نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

"جانی ۔ یعنی کہ جانی گیا" اس نے بوکھلا کر کہا اور پہلی مرتبہ ان کی طرف دیکھا، پھر بھڑک کر پیچھے ہٹی اور ڈرے ڈرے انداز میں ہکلاتے ہوئے بولی:

"آ ۔ آ ۔ آپ ۔ کک ۔ کون ہیں؟"

"مہمان" انسپکٹر جمشید بولے: "خیر تو ہے، آپ بہت گھبرائی ہوئی ہیں"

"وہ، وہ، جانی ۔ لیکن آپ کو کیا معلوم کہ ......"

اس کے الفاظ درمیان میں ہی رہ گئے۔ اسی وقت دوڑتے قدموں کی آواز ابھری تھی، پھر حویلی کا صدر دروازہ کھلا اور اس میں سے کئی آدمی باہر نکلے۔ ان میں سب سے آگے ایک جھکی ہوئی کمر والا بوڑھا تھا۔ اس کے سر اور ڈاڑھی کے بال بالکل سفید ہو چکے تھے۔ یہاں تک کہ بھنویں تک سفید تھیں۔ اس کے دائیں ہاتھ میں بید کی ایک چھڑی تھی، جس کا سرا مڑا ہوا تھا۔ مڑے ہوئے سرے پر اس بوڑھے کا ہاتھ تھا اور وہ اس کے سہارے چل رہا تھا۔

پھر ان سب کی نظریں اس لڑکی پر جم گئیں۔

"کیا ہوا عابدہ سلطانہ" بوڑھے نے پریشان ہو کر کہا۔

"جی، وہ، جانی ۔ جی ہاں جانی"

"جانی، اوہ، تمہارا مطلب جانِ عالم سے ہے۔ ہاں تو کیا ہوا جانِ عالم کو"

"جی وہ ۔ اپنے کمرے میں ....." لڑکی پھر بات پوری نہ کر سکی۔ خوف اس پر بہت بری طرح سوار تھا۔

"جب تک آپ پوری بات نہیں بتائیں گی، کسی کی سمجھ میں کس طرح آئے گی" انسپکٹر جمشید بول پڑے۔ ان کی آواز سن کر اس بوڑھے اور دوسرے لوگوں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور پھر بوڑھے کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں ۔

"اف خدا، کیا میں خواب دیکھ رہا ہوں ۔ یا یہ سچ مچ تم ہو ۔ جمشید، تم تو ذرا بھی نہیں بدلے ۔ وہی شکل، وہی صورت، وہی قدوقامت، زمانے نے تم میں ذرا بھی تبدیلی نہیں کی ۔ آؤ بیٹا، میرے سینے سے لگ جاؤ"

اس وقت انہیں معلوم ہوا کہ وہ بوڑھا دراصل نواب صاحب تھے ۔

"تو کیا آپ کا خیال یہ تھا کہ آپ کا خط پڑھ کر بھی میں نہیں آؤں گا"

"مجھے یہ تو معلوم تھا کہ تم آجاؤ گے، لیکن یہ سوچ بھی نہ سکا کہ بغیر اطلاع آجاؤ گے؛ بہرحال تم نے دل خوش کر دیا۔"

یہ کہہ کر وہ پُرجوش انداز میں ان کی طرف بڑھے اور ان سے لپٹ گئے، پھر ان تینوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ انہیں بھی محبت بھرے انداز میں اپنے سینے سے لگایا۔ آخر میں بیگم جمشید پر ان کی نظریں جم گئیں۔

"تو یہ ہیں ہماری بہو۔" یہ کہہ کر انھوں نے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر کہا:

"آؤ بھئی، پہلے تو تم لوگ اندر چل کر اطمینان سے بیٹھو۔"

"لیکن پہلے ہم یہ کیوں نہ معلوم کریں کہ یہ جانی یعنی جان عالم کون صاحب ہیں۔ یہ اس طرح بدحواسی کے عالم میں کوٹھی سے باہر کیوں نکل آئیں؟"

"وہ۔ وہ۔ جانی ....."

"یہ تو آپ پہلے بھی دو تین بار کہہ چکی ہیں۔" فاروق نے منہ بنایا اور نواب صاحب مسکرا دیے، پھر عابدہ کی طرف مڑے:

"جلدی بتائیے، کیا ماجرا ہے؟"

"آپ۔ آپ خود ہی اندر چل کر دیکھ لیں۔"

حویلی سے نکلنے والوں میں دو ملازم تھے اور دو تین اور حضرات تھے۔ ان لوگوں کو انسپکٹر جمشید نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"چلو، پھر پہلے اندر چل کر دیکھ لیں کہ یہ ہمیں کیا دکھانا چاہتی ہیں اور جان عالم کو کیا ہوا ہے۔" نواب صاحب نے تنگ آ کر

کہا۔

یہ چھوٹا سا قافلہ صدر دروازے سے اندر داخل ہوا۔ اس دوران نواب صاحب کے ملازموں نے ان کا سامان اٹھا لیا تھا۔ حویلی کے اندر انہیں ایک بہت کھلا صحن نظر آیا۔ اوپر آسمان نظر آ رہا تھا۔ صحن کے دائیں طرف ایک زینہ اوپر جا رہا تھا، لیکن زینے کے ساتھ دو کمروں کے دروازے تھے۔ اسی طرح ان کمروں کے بالکل سامنے دوسری طرف بھی دو کمروں کے دروازے تھے۔ عابدہ سلطانہ اگرچہ ان سب سے آگے آگے تھی، لیکن پھر بھی ایسا معلوم ہو رہا تھا، جیسے وہ ان سب سے پیچھے رہ کر چلنے کی خواہش مند ہو۔ آخر وہ اوپر پہنچے اور ایک برآمدے کے تیسرے کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا ملا تھا۔

انہوں نے دیکھا کہ ایک نوجوان آدمی بستر پر بالکل چت لیٹا ہے۔ اس کی آنکھیں کھلی ہیں اور چھت کو گھور رہی ہیں۔ ان آنکھوں کو دیکھ کر انسپکٹر جمشید کو ایک عجیب سا احساس ہوا۔ انہوں نے دل ہی دل میں کہا:

"یہ آنکھیں کسی زندہ انسان کی تو ہو نہیں سکتیں۔"

"ارے بھئی جان عالم، آپ کو کیا ہوا؟" نواب صاحب بولے۔

انسپکٹر جمشید تیزی سے آگے بڑھے۔ انہوں نے جان عالم کی پیشانی کو چھو کر دیکھا۔ اس نے گردن تک چادر اوڑھ رکھی تھی۔ انہوں نے ایک

جھٹکے سے چادر اتار دی — دوسرے ہی لمحے کمرے میں کئی چیخیں گونج اُٹھیں — جان عالم کے پیٹ میں ایک سنہری دستے والا خنجر دھنسا ہوا تھا۔ بستر پر خون پھیل گیا تھا؛ تاہم یہ خون نیچے فرش پر نہیں ٹپک سکا، بستر کافی موٹا تھا۔ انسپکٹر جمشید نے اس کے بدن کی حرارت محسوس کی۔ بدن ابھی تک گرم تھا۔ یوں لگتا تھا، جیسے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی خنجر اس کے پیٹ میں اتارا گیا ہو۔

"یہ مر چکے ہیں، شاید آدھ گھنٹہ پہلے" انسپکٹر جمشید نے گویا اعلان کیا —

"اُف میرے خدا — یہ کیا ہوا؟" نواب صاحب نے لرزتی آواز میں کہا۔

"آپ نے بتایا نہیں — یہ کون لوگ ہیں؟"

"یہ عابدہ سلطانہ اور یہ تینوں نوجوان، ابھی پندرہ دن پہلے یہاں آئے ہیں" انہوں نے بتایا۔

"کہاں سے آئے ہیں۔ کیا یہ آپ کے رشتے دار ہیں"

"نہیں، یہ چاروں میرے ایک دوست کا خط لے کر آئے ہیں — آثارِ قدیمہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے کسی سے یہاں کے کھنڈرات کے بارے میں سُن لیا، لہٰذا ان کھنڈرات کی تحقیقات کا شوق انہیں یہاں کھینچ لایا — ان کے کسی مہربان نے میرے نام ایک تعارفی خط دے دیا۔ وہ مہربان میرے بھی بہت اچھے دوست

ہیں۔ خط میں یہ بھی درخواست تھی کہ یہ جتنے دن بھی اس قصبے میں گزاریں، اس حویلی میں رہیں — بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا میرے پاس کس چیز کی کمی ہے۔ میں نے انہیں خوشی خوشی یہاں ٹھہرا لیا۔ باقی حالات تو میں بعد میں سناؤں گا۔ پہلے تو اس لاش کا کچھ کرنا چاہیے۔"

"لاش کے قریب آنے کی کوئی شخص کوشش نہ کرے۔ آپ جہان خان صاحب کو بلائیں۔ انہیں فون پر ہی بتا دیں کہ یہاں ایک قتل ہو چکا ہے، تاکہ وہ انتظام کر کے آئیں۔"

"قتل، تم کیا کہہ رہے ہو" نواب صاحب بولے۔

"تو کیا آپ کا خیال یہ ہے کہ جان عالم نے خودکشی کی ہے۔ نہیں نواب انکل، یہ صاف طور پر قتل کی واردات ہے۔ کوئی شخص بھی اتنے اطمینان سے لیٹ کر اپنے پیٹ میں خنجر نہیں گھونپ سکتا — اور ہاں، ان دونوں حضرات کے نام کیا ہیں۔ ان کا اشارہ عابدہ سلطانہ اور جان عالم کے دونوں ساتھیوں کی طرف تھا — ان دونوں کے چہرے دودھ کی طرح سفید نظر آ رہے تھے۔

"یہ نواز خاطر ہیں اور یہ آفاق شیرازی" نواب صاحب نے بتایا، پھر فون کرنے کے لیے مُڑ گئے —

"یہ خنجر کتنا عجیب ہے ابا جان" فرزانہ بڑبڑائی۔

"ہاں، دستہ سونے کا ہے"

"جی، کیا فرمایا۔ سونے کا دستہ ہے۔" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں بھئی، یہ پیتل یا تانبے کا نہیں، خالص سونے کا ہے۔ ابھی نواب انکل آتے ہیں تو تصدیق ہو جائے گی۔"

نواب صاحب کے ساتھ ان کے ملازم اور وہ دونوں نوجوان بھی کمرے سے باہر نکل گئے تھے، لہٰذا اب کمرے میں صرف وہی چاروں موجود تھے۔

"ابا جان، یہاں تو آتے ہی لاش سے ملاقات ہو گئی۔ اب کیا ہوگا۔" فاروق نے پریشان آواز میں کہا۔

"بھئی ہوگا کیا، وہی ہوگا جو منظورِ خدا ہوگا۔"

"یہاں حالات ناساز گار تھے، تبھی تو نواب صاحب نے ہمیں بلایا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ اس قتل سے پہلے بھی بہت کچھ ہو چکا ہے یہاں، اور اس بہت کچھ نے ہی نواب انکل کو پریشان کیا تھا۔ اس قتل کے بارے میں تو شاید انھوں نے خواب میں بھی نہ سوچا ہوگا۔" انھوں نے جلدی جلدی کہا۔

"یہ لوگ ان کھنڈرات کے بارے میں تحقیقات کرنے آئے تھے جن کے بارے میں بڑے بڑے ماہر کچھ معلوم نہیں کر سکے، کہیں انھوں نے کوئی خاص بات تو معلوم نہیں کر لی۔ اور یہ قتل اسی خاص بات کے سلسلے میں تو نہیں ہوا۔" فرزانہ نے سوچ میں ڈوبے

ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہاں، یہ عین ممکن ہے۔"

اسی وقت قدموں کی آواز سنائی دی۔ انھوں نے دیکھا، نواب صاحب اور کچھ دوسرے لوگ چلے آ رہے تھے۔ ان میں دو تو ان کے ملازم تھے اور دو وہی نوجوان تھے، یعنی عابدہ کے ساتھی۔ باقی لوگوں میں ایک نوجوان لڑکی اور دو ادھیڑ عمر کے مرد اور دو ادھیڑ عمر عورتیں تھیں۔ نوجوان لڑکی کا لباس گھٹیا سا تھا۔

"فون کر دیا ہے میں نے۔" نواب صاحب نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"شکریہ انکل، اب آپ باقی لوگوں سے بھی ہمارا تعارف کرا دیں۔"

"اوہ ہاں، ان دونوں کے نام تو میں بتا چکا ہوں، نواز خاطر اور آفاق شیرازی۔ یہ لڑکی ان چاروں کی نوکرانی ہے۔ اسے یہ اپنے ساتھ لائے ہیں۔ یہ ان کے کام کاج کا خیال رکھتی ہے۔ یہ دونوں میرے ملازم رحیم، کریم ہیں۔ مالی آج نہیں آیا۔ مالی، مالی کا بیٹا اور اس کی بیوی تینوں باغ کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ آج ان تینوں کو اپنے کسی عزیز کی شادی میں جانا تھا۔ باقی رہے یہ دو۔ یہ میرے بیٹے اور یہ ان کی بیویاں ہیں۔ ان کے بچے شہر کے کالجوں میں پڑھتے ہیں اور وہیں ہوسٹلوں میں رہتے ہیں۔ میرے

دونوں بیٹوں کے نام نصرالدین اور شاکرالدین ہیں ۔ ان کی بیویوں کے نام رضیہ اور رانی ہیں ۔۔ یہ تو تھا، ان کا تعارف اور اب میں انہیں تم لوگوں کے بارے میں بتاتا ہوں ۔" یہ کہہ کر وہ ان کے بارے میں تفصیل سے بتاتے چلے گئے ۔ ان لوگوں کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں ۔ ان کے خاموش ہونے پر انسپکٹر جمشید بولے :

" اب ہمیں اس خنجر کے بارے میں بتائیے ۔"

" ہاں، یہ خنجر ۔ یہ میری نوادرات والی الماری میں سے چرایا گیا ہے ۔"

" اوہ ۔" ان کے منہ سے نکلا ۔ اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی ۔

عجیب نشانات

" رحیم، تم دیکھو دروازے پر کون ہے ۔ شاید یہ جہان خان ہوں گے ۔ انہیں یہیں لے آنا ۔" نواب صاحب جلدی سے بولے ۔

" جی بہتر ۔" رحیم نے کہا اور چلا گیا ۔

" تو کیا آپ نوادرات کی الماری کو تالا نہیں لگاتے ؟" محمود نے پوچھا ۔

" نہیں، میری حویلی سے آج تک کوئی چیز چوری نہیں ہوئی ۔ پورے قصبے میں میرا اعلان ہے، جس شخص کو جس چیز کی ضرورت ہے، وہ مجھ سے لے لے ۔ ان حالات میں بھلا کوئی چوری کیوں کرنے لگا ۔ یہ چوری بھی خنجر کو چرانے کے لیے نہیں ۔ جان عالم کو قتل کرنے کے لیے کی گئی ہے ۔" انہوں نے بتایا ۔

" گویا کسی وقت بھی اس الماری سے خنجر نکالا جا سکتا تھا ۔" فاروق بولا ۔

" ہاں، نوادرات کی الماری میرے اپنے کمرے میں نہیں ہے، بلکہ

حویلی کے ہال میں ہے۔ یہ کمرہ سب کے لیے ہے۔ یہاں ایک چھوٹی
سی لائبریری بھی ہے۔ مہمان وہاں جاکر مطالعہ بھی کر سکتے ہیں اور
نوادرات بھی دیکھ سکتے ہیں۔"

"اور گھرانے کے افراد بھی۔"

"ہاں، جب مہمانوں پر ہی کوئی پابندی نہیں، تو گھر کے افراد
پر بھلا کیا پابندی ہوگی۔"

اسی وقت بھاری قدموں کی آواز سنائی دی اور پولیس کے
کچھ افراد اندر داخل ہوئے۔

"لیجیے، جہان خان آگئے۔ خان صاحب، انسپکٹر جمشید اور ان
کے بچوں سے ملیے۔" نواب صاحب نے تعارف کرایا۔

"ارے!" اس کے منہ سے نکلا، پھر اس نے آگے بڑھ کر ان
سے مصافحہ کیا، لیکن اس کے انداز میں گرم جوشی نہیں تھی۔ ایسا معلوم
ہوتا تھا، جیسے اسے ان کی آمد سے خوشی نہ ہوئی ہو۔

"لیجیے جناب، ہمارے یہاں آتے ہی ایک قتل ہوگیا، بلکہ یہ
کہنا چاہیے کہ قتل پہلے ہوا اور ہم بعد میں یہاں داخل ہوئے۔"
انسپکٹر جمشید نے بھرپور انداز میں مسکرا کر کہا۔

"خدا اپنا رحم کرے۔ میں نے سنا ہے، آپ لوگ جہاں بھی
جاتے ہیں، وہاں عجیب و غریب چکر چل پڑتے ہیں اور بہت تیز
رفتاری سے بھی۔" جہان خان نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"شاید یہ بات ٹھیک ہے، لیکن یہاں تو پہلے ہی کوئی چکر شروع
ہوچکا تھا، اگر ایسا نہ ہوتا تو نواب انکل ہمیں ہرگز یہاں آنے
کی دعوت نہ دیتے، کیوں نواب انکل؟"

"بالکل ٹھیک، اس میں کوئی شک نہیں۔"

"اچھا اب آپ مہربانی فرما کر اپنی کارروائی کیجیے۔ خنجر کو ابھی
تک چھوا نہیں گیا۔ قاتل نے اگر دستانے نہیں پہن رکھے تھے تو
اس کی انگلیوں کے نشانات ضرور مل جائیں گے۔"

"آپ فکر نہ کریں، ہم اپنا کام کرنا جانتے ہیں۔"
انسپکٹر جمشید نے محسوس کیا کہ اسے ان کی موجودگی گراں گزر رہی
ہے، لہذا وہ باہر نکل آئے۔

"آؤ بھئی، ہم ذرا نوادرات کی الماری دیکھ لیں۔"

"جی ہاں، میں خود اسے دیکھنے کے لیے بے تاب ہوں۔" فرزانہ
نے جلدی سے کہا۔

"ایک تو تم میں یہ بہت بری عادت ہے کہ ہر چیز دیکھنے
کے لیے بے تاب ہو جاتی ہو۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"اسے جذبۂ تجسس کہتے ہیں فاروق، جو تم میں نہیں ہے۔" فرزانہ
نے طنز کیا۔

"لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ مجھ میں یہ جذبہ نہیں ہے۔"
اس نے حیران ہو کر کہا۔

"اگر ہوتا تو میری طرح تم بھی بے چین ہوتے۔"

"نہیں فرزانہ، یہ تو تم نہیں کہہ سکتیں کہ فاروق میں تجسس کا جذبہ نہیں ہے۔ یہ جذبہ تو ہر کسی میں ہوتا ہے۔ ہاں کم یا زیادہ ضرور ہو سکتا ہے۔" محمود نے درمیان میں پڑتے ہوئے کہا۔

ملازم کے ساتھ وہ ہال میں داخل ہوئے۔ انسپکٹر جمشید نے اس کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔

"کریم تم جاؤ، ہم خود ہی دیکھ لیں گے اور ہاں، نواب صاحب کو بھی یہیں بھیج دو۔ ہم ان سے علیحدگی میں بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"جی اچھا۔" کریم نے کہا اور چلا گیا۔

وہ ہال کا جائزہ لیتے پھرے۔ یہ بہت بڑا ہال تھا۔ ہر چیز پرانے زمانے کی تھی۔ دروازے، کرسیاں، میزیں، لیکن یہ سب کی سب بالکل درست حالت میں تھیں اور نئی معلوم ہوتی تھیں۔ کئی الماریوں میں انہیں قیمتی کتابیں بھی نظر آئیں۔ ایک الماری پر نوادرات لکھا نظر آیا۔ انہوں نے الماری کے پٹ کھول دیے۔ الماری کے چار خانے تھے۔ ان چاروں میں شیشے کے بکس رکھے ہوئے تھے اور ان بکسوں میں مختلف قسم کی عجیب و غریب چیزیں سلیقے سے رکھی تھیں۔ بکسوں کی کنڈیوں میں تالے نہیں تھے۔ ان کے ڈھکنے کھول کر چیزیں نہایت آسانی سے نکالی جا سکتی تھیں۔ ان بکسوں میں زیادہ تر پرانے زمانے کی چیزیں تھیں۔ درمیان والے خانے میں انہیں بالکل ویسے

ہی تین خنجر اور نظر آئے، جیسا جان عالم کے پیٹ میں نظر آیا تھا۔

"ارے، یہاں تو تین خنجر اور بھی ہیں۔" فرزانہ کے منہ سے نکلا۔

"ہاں، یہ ضرور کسی بادشاہ کے رہے ہوں گے۔" محمود بڑبڑایا۔

انسپکٹر جمشید نے بکس کھول کر ان خنجروں کو نکال کر دیکھا تو بہت تیز دھار والے خنجر تھے۔ ابھی وہ ان کا معائنہ کر ہی رہے تھے کہ قدموں کی چاپ سنائی دی۔ مڑ کر دیکھا تو نواب صاحب چلے آ رہے تھے۔

"میں نے مناسب جانا کہ یہاں آپ سے سارے حالات سن لیے جائیں۔ اس دوران پولیس اپنی کارروائی مکمل کرتی رہے گی۔"

"تم نے اچھا کیا۔ میں نے سوچا تو یہ تھا کہ تم آؤ گے تو ایک دو دن خوب خاطر تواضع کروں گا اور پھر بیٹھ کر یہاں کے حالات سناؤں گا، لیکن تمہارے یہاں آتے ہی لاش کا چکر چل گیا، لہٰذا اب دیر نہیں کرنا چاہیے۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"حویلی میں اس سے پہلے کبھی ایسے واقعات نہیں ہوئے۔ اتنا عرصہ ہو گیا یہاں رہتے ہوئے، میں نے اپنے بیٹوں، ان کی بیویوں اور ان کے بچوں پر کبھی کوئی پابندی نہیں لگائی۔ خرچ کا کبھی کوئی حساب نہیں رکھا۔ وہ پوری آزادی سے خرچ کر سکتے ہیں۔ یہ بات بھی انہیں معلوم ہے کہ میں نے زندگی میں ہی اپنی تمام دولت میں

سے دو تہائی کا مالک ان سب کو بنا دیا ہے۔ یہ اس کے برابر کے حصّے دار ہیں۔ ایک تہائی سے میں نے قصبے میں ایک شان دار مسجد بنوانے کی وصیت کر رکھی ہے، بلکہ میں سوچ رہا ہوں کہ اپنی زندگی میں ہی اس کی بنیاد رکھوا دوں، ہو سکے تو مکمل بھی کرا دوں، لہٰذا ان لوگوں کو میرے مرنے کی کوئی جلدی نہیں، نہ ہی ان میں سے کوئی میری موت کی خواہش کر سکتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ کہ حویلی میں کچھ روز سے جو واقعات پیش آرہے ہیں، ان کا تعلق میرے بچوں اور ان کی بیویوں سے تو ہرگز نہیں ہو سکتا، لہٰذا میں کہنے پر مجبور ہوں کہ ان واقعات کے ذمّے دار ضرور یہ نئے مہمان ہیں، جن میں سے ایک آج اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہے۔ اسے کس نے قتل کیا، میں نہیں جانتا۔ کیوں قتل کیا، میں یہ بھی نہیں جانتا۔ میرے دوست کا خط اگر یہ لوگ نہ لائے ہوتے تو میں کبھی کا انہیں حویلی سے نکال دیتا، لیکن جس روز یہ خط لے کر آئے تھے اور میں نے اپنے دوست کا خط پڑھا تھا، اسی روز میں نے اپنے دوست کو لکھ دیا تھا کہ وہ فکر نہ کرے۔ اس کے دوستوں کی یہاں بہت خاطر مدارات کی جائے گی اور انہیں مجھ سے کسی قسم کی شکایت نہیں ہوگی، لہٰذا میں انہیں نکالنے پر کسی طرح بھی خود کو تیار نہیں پاتا۔ جس روز سے یہ آئے ہیں، ہر روز ان کھنڈرات کی طرف جاتے ہیں جو تمہیں بھی پراسرار لگا کرتے تھے۔ رات کو دیر تک اپنے

کمرے میں باتیں کرتے ہیں۔ آپس میں بحث بھی کرتے ہیں اور بحث کے دوران جھگڑتے بھی ہیں؛ تاہم ان کی آوازیں اونچی نہیں ہوتیں۔ سب سے پہلا عجیب واقعہ تو یہ پیش آیا کہ ان کے آنے کے تیسرے دن میں نے برآمدے میں ایک سیاہ رنگ کا بچھو دیکھا۔"

"سیاہ رنگ کا بچھو؟" وہ چونک اٹھے۔

"ہاں، سیاہ رنگ کا خوف ناک بچھو۔ ہمارے ہاں کے بچھوؤں سے تقریباً چار گنا بڑا۔ اسے دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اگر وہ کسی کو کاٹ لیتا تو یقیناً اس کی موت واقع ہو جاتی، کیونکہ میں نے اس قسم کے بچھوؤں کے بارے میں ایک کتاب میں پڑھا تھا، وہ کتاب یہاں کسی الماری میں ضرور موجود ہو گی۔ میں نے فوراً اس بچھو کو مار دیا، لیکن حیران کن بات یہ تھی کہ حویلی میں وہ بچھو آیا کہاں سے؟ اس حویلی میں تو گزشتہ چالیس پچاس سال سے کسی نے یہاں کے بچھو کی صورت نہیں دیکھی، تو پھر کسی دُور دراز پہاڑی علاقے کا بچھو بھلا یہاں کہاں سے آگیا۔ اس بات نے مجھے پریشان کر دیا۔ میرا خیال نئے مہمانوں کی طرف گیا کہ کہیں یہ بچھو ان میں سے تو کسی کے پاس نہیں تھا، اگرچہ یہ ایک عجیب بات تھی، پھر بھی میں ان سے پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ ان کا اس بچھو سے کوئی تعلق نہیں؛ تاہم وہ بچھو کے ذکر پر

خوف زدہ ضرور ہوگئے تھے۔" یہ کہہ کر نواب صاحب سانس لینے کے لیے رکے ہی تھے کہ انسپکٹر جمشید بولے:

"کیا آپ نے اس سلسلے میں اپنے دوست کو خط لکھا؟"

"دوست کو خط، تمہارا مطلب ہے، اس دوست کو، جس کا یہ لوگ خط لے کر آئے ہیں۔ نہیں، میں نے اسے بعد میں کوئی خط نہیں لکھا۔"

"وہ کہاں کا رہنے والا ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"ملک کے دوسرے سرے پر ایک پہاڑی علاقے میں رہتا ہے۔ یہ لوگ بھی وہیں کے رہنے والے ہیں۔"

"ہوں، تو پھر آج ہی اپنے دوست کو خط لکھیے اور پوچھیے کہ کیا اس علاقے میں اس قسم کے بچھو پائے جاتے ہیں۔"

"اوہ، واقعی، یہ بہت ضروری بات ہے۔" نواب صاحب حیران ہو کر بولے۔

"اگر اس سے فون پر بات ہو سکتی ہے تو فون پر کرلیں، ورنہ تار دے دیں۔"

"ٹھیک ہے، میں تار دے دیتا ہوں۔"

"اچھا، آگے چلیں۔ پھر کیا ہوا؟"

"بچھو والے معاملے نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ کسی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ حویلی میں بچھو کہاں سے آگیا جبکہ

پورے قصبے میں ایسا بچھو کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ رات کے وقت بھی کئی بار خوف سوار ہوا کہ کہیں ویسا ہی کوئی بچھو بستر پر نہ رینگ رہا ہو۔ ایک روز حویلی میں کوئی بھاری قدموں سے چلتا رہا۔ میں نے اور میرے بیٹوں نے کون کون کا شور مچایا، لیکن کوئی کچھ نہ بولا۔ باہر نکل کر دیکھا تو کوئی بھی نہیں تھا۔ صدر دروازے کو دیکھا گیا تو اندر سے بند تھا۔ حویلی میں داخل ہونے کے جتنے بھی دروازے تھے، سب اندر سے بند پائے گئے۔ آخر مہمانوں کو اٹھایا گیا۔ چاروں آنکھیں ملتے اٹھے اور اس بات پر حیرت ظاہر کی کہ حویلی میں کوئی بھاری قدموں سے چل رہا تھا۔ اب تو میں بہت پریشان ہوا، یہ بیٹھے بٹھائے کیا چکر شروع ہو گیا تھا۔ ایسے حالات بھلا ہم نے کب دیکھے تھے۔ تیسرے دن برآمدے میں رات کے بارہ بجے کے قریب خوب توڑ پھوڑ مچائی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے بہت سے آدمی آپس میں لڑ بھڑ رہے ہوں، بےشمار برتنوں کے ٹوٹنے کی آواز سنائی دی۔ آخر میں اور میرے بیٹے ڈرتے ڈرتے باہر نکلے، لیکن یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے کہ برآمدے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک بار پھر انہیں جگایا گیا، یہ پھر گہری نیند سے سوتے ہوئے اٹھے اور جمائیاں لیتے ہوئے دروازے تک آئے۔ چاروں ایک ہی کمرے میں سونا پسند کرتے ہیں۔ اگرچہ میں نے انہیں چار کمرے دے رکھے ہیں۔ جب ان سے ان آوازوں

کے بارے میں پوچھا گیا تو وہ بہت حیران ہوئے اور کہنے لگے کہ انہوں نے تو سرے سے کوئی آواز نہیں سنی۔ میرے بیٹے شاکر نے اس روز ڈر کر یہ کہا کہ حویلی میں ضرور آسیب گھس آئے ہیں، لیکن میں ایسی باتیں ماننے پر تیار نہ ہوا اور میں نے دوسری صبح جہان خان کو بلا لیا۔ اس نے تمام حالات کا جائزہ لیا اور آخر بولا:

"نواب صاحب، یہ تو واقعی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حویلی میں ضرور آسیب گھس آئے ہیں"

"کیا بات کرتے ہیں خان صاحب، اتنا عرصہ ہو گیا، اس حویلی میں رہتے ہوئے۔ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔"

"بھوت پریت کا پروگرام بنتے کیا دیر لگتی ہے بھلا۔" جہان خان نے کہا۔

غرضیکہ کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ آوازیں اسی طرح آتی رہیں۔ راتوں کو سونا حرام ہو گیا۔ اب تو برآمدوں میں نکلتے بھی ڈر لگنے لگا ہے؛ حالانکہ میں کوئی بزدل نہیں، لیکن جب برآمدوں میں کسی کو نہیں پاتے اور لڑنے بھڑنے اور برتن ٹوٹنے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں، تو خوف تو محسوس ہوتا ہی ہے۔ آخر تنگ آ کر میں نے تمہیں بلانے کا پروگرام بنایا۔ اب یہ کسے معلوم تھا کہ ادھر تم آؤ گے اور ادھر قتل ہو جائے گا۔" یہاں تک کہہ کر نواب صاحب

خاموش ہو گئے۔

"ہوں تو یہ حالات ہیں۔۔۔ اچھا یہ چاروں اپنی نوکرانی کو بھی تو ساتھ لائے تھے؟"

"ہاں، نوکرانی بھی اسی علاقے کی رہنے والی ہے۔ وہ تو ہماری زبان بھی نہیں سمجھتی۔ یہ لوگ تو خیر اردو بول بھی لیتے ہیں۔"

"وہ کہاں سوتی ہے؟" فاروق نے پوچھا۔

"اسے ملازمین کے کوارٹرز میں سے ایک کوارٹر دے دیا ہے، اس میں سوتی ہے؛ تاہم ملازمین رات کو بھی حویلی کے اندر آ جا سکتے ہیں۔"

"جب یہ لوگ کھنڈرات کی طرف جاتے ہیں تو کیا یہ بھی ان کے ساتھ جاتی ہے؟" محمود نے پوچھا۔

"نہیں، وہ اسے ساتھ نہیں لے جاتے۔"

"ہوں، کیا یہ کھنڈرات کی طرف روزانہ جاتے ہیں؟"

"ہاں، بلا ناغہ جاتے ہیں۔"

"ویسا بچھو پھر تو نظر نہیں آیا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"نہیں۔"

"خیر، آپ فکر نہ کریں، ہم دیکھیں گے کہ یہ چکر کیا ہے، اگر خنجر پر انگلیوں کے نشانات مل گئے تو یہ بہت اچھی بات ہوگی۔ ویسے یہ لوگ کھنڈرات میں کس وقت جاتے ہیں اور کیا ساز و

سامان لے کر جاتے ہیں۔"

"صبح ناشتے کے بعد نکل جاتے ہیں۔ کھدائی کا سامان ان کے ساتھ ہوتا ہے۔"

"ہوں، اس قصبے کا نام رومان چند ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی ہندو نے آباد کیا تھا۔ کہیں یہ حویلی بھی تو اسی نے نہیں بنوائی تھی۔"

"سنا ہے، یہ حویلی رومان چند کے وزیر کی تھی اور وہ کھنڈرات رومان چند کے محل کے ہیں۔"

"اوہو اچھا، یہ کیسے معلوم ہوا آپ کو۔"

"قصبے میں یہ بات بہت پرانی چلی آتی ہے۔ ایک مشہور بات۔ لیکن میرا خیال ہے کہ جو بات مشہور ہو، اس کی تہہ میں کچھ نہ کچھ تو حقیقت ہوتی ہے۔"

"ہوں ٹھیک ہے۔ قصبہ رومان چند کی تاریخ پر اگر مجھے کوئی کتاب مل جاتی تو شاید میں بہت جلد اصل راز سے پردہ اٹھانے میں کامیاب ہو جاتا۔"

"ایسی کوئی کتاب شاید تھانے میں ہو۔ ڈی ایس پی جہان خان سے معلوم کرنا ہوگا۔"

"اس سے آپ ہی معلوم کیجیے گا۔ اسے ہمارا یہاں آنا اچھا نہیں لگا۔" انہوں نے کہا۔

"اوہو اچھا۔" نواب صاحب نے حیران ہو کر کہا۔

"آئیے، ذرا دیکھیں۔ ان لوگوں نے اب تک کیا معلوم کیا ہے۔ اس دوران آپ باتوں باتوں میں قصبہ رومان چند کی تاریخ پر کسی کتاب کے بارے میں بھی پوچھ لیجیے گا۔"

"چلو۔"

اور وہ ہال سے نکل کر کمرۂ واردات میں آئے۔ لاش کی تصاویر لی جا چکی تھیں۔ خنجر پر سے بھی نشانات اٹھائے جا چکے تھے۔ جہان خان نے یہ بات فخریہ انداز میں بتائی۔

"خنجر پر بھی کسی کی انگلیوں کے نشانات ہیں جناب، اب مجرم گرفتاری سے نہیں بچ سکے گا۔"

"ویری گڈ، یہ تو بہت اچھی خبر ہے۔" انسپکٹر جمشید بھی خوش ہو کر بولے۔

"خان صاحب، آپ کے تھانے میں قصبے کی تاریخ پر ایک کتاب موجود ہے۔" نواب صاحب نے سرسری انداز میں کہا۔

"ہاں، کیوں کیا بات ہے۔"

"کچھ نہیں، انسپکٹر جمشید ذرا اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"بہت بہتر۔ صبح لیتا آؤں گا۔" اس نے ایسے انداز میں کہا، جیسے یہ بتا کر بڑی غلطی کی ہو کہ ایسی کوئی کتاب موجود ہے۔

"شکریہ جناب، دراصل مجھے اس قصبے کی تاریخ سے بہت

دلچسپی ہے۔ بچپن میں میں یہاں اپنے والد صاحب کے ساتھ اکثر آتا رہا ہوں ۔ بس اس کتاب کو پڑھ کر اپنے بچپن کی یادیں تازہ کرنا چاہتا ہوں ۔"

"اوہ، میں سمجھا تھا، شاید اس کیس کے سلسلے میں پڑھنا چاہتے ہیں ۔"

انسپکٹر جمشید نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ کمرے کے فرش پر پڑی ایک ننھی سی چیز کی طرف متوجہ ہو گئے تھے، پھر وہ ایک دم آگے بڑھے اور اسے اٹھا لیا ۔ یہ پیتل کا بنا ہوا ایک بچھو تھا۔ انہوں نے حیرت بھرے انداز میں اسے دیکھا اور پھر نواب صاحب کی طرف بڑھا دیا۔ نواب صاحب اسے دیکھ کر اچھل پڑے ۔ ان کے منہ سے نکلا :

"اف خدا! یہ تو بچھو ہے لیکن بہت ننھا سا ۔ وہ سیاہ بچھو تو اس سے کوئی آٹھ دس گنا بڑا تھا ۔"

"لیکن یہ بچھو یہاں کہاں سے آیا، جس طرح آپ کو زندہ بچھو کو حویلی میں دیکھ کر حیرت ہوئی تھی، اسی طرح مجھے اس بچھو کو یہاں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ میرے خیال میں یہ بچھو یا تو جان عالم کا ہے یا پھر قاتل کا ۔ مجھے حیرت ہے کہ بچھوؤں کا کیا معاملہ ہے ۔"

"اور مجھے تو ہر بات پر حیرت ہے ۔" فاروق بولا۔

"خان صاحب، خنجر پر ملنے والے انگلیوں کے نشانات کی رپورٹ

کب تک مل جائے گی ۔"

"نشانات لیتے ہی میں نے اپنا آدمی لیبارٹری بھیج دیا تھا۔ بس وہ آنے ہی والا ہو گا ۔"

"ابا جان، میرے خیال میں تو جان عالم کا قاتل ان تینوں میں سے ایک ہے ۔" فرزانہ نے سرگوشی کی ۔

"ہوں، اس کے سوا ہم اور کیا خیال کر سکتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ تینوں میں سے ہے کون ؟" وہ بولے ۔

"انگلیوں کے نشانات موجود ہیں، لہٰذا قاتل کی شخصیت سامنے آنے میں اب کیا دیر لگے گی ۔"

"ہوں دیکھا جائے گا ۔" انہوں نے سوچ میں گم لہجے میں کہا ۔

آدھ گھنٹے بعد جہان خان کا ماتحت وہاں پہنچ گیا۔ اس نے رپورٹ اس کے حوالے کر دی ۔ جہان خان نے بے تابی کے عالم میں رپورٹ کھول کر پڑی اور پھر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں ۔

"خیر تو ہے جناب ۔" انسپکٹر جمشید بولے

"لیجیے، آپ بھی دیکھ لیجیے ۔" اس نے کہا اور رپورٹ ان کے حوالے کر دی ۔

"انہوں نے ایک ساتھ رپورٹ کو پڑھا اور پھر حیرت زدہ رہ

گئے ۔ انگلیوں کے نشانات کسی انسان کی انگلیوں کے نہیں تھے۔
نشانات کی تصاویر بھی ساتھ کی گئی تھیں ۔ انہوں نے انہیں بھی
دیکھا ۔ یہ تصویریں واقعی کسی انسانی ہاتھ کی انگلیوں کے نشانات
کی نہیں تھیں ۔

فاروق کی چیخ

انہوں نے انگلیوں کے نشانات کو غور سے دیکھا، پھر ایک دوسرے
کی طرف دیکھا ۔ سب لوگوں پر موت کی سی خاموشی طاری تھی۔
شاید کسی کا بھی بولنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس قدر عجیب
بات سے ان کا واسطہ کبھی نہیں پڑا تھا ۔

" تو ۔ تو کیا جان عالم کو کسی بھوت پریت نے ہلاک کیا
ہے ۔" آخر عابدہ سلطانہ نے خوف سے تھر تھر کانپتی آواز میں کہا۔

" ان نشانات سے تو یہی ثابت ہوتا ہے!" نواز خاطر بڑبڑایا۔

" لیکن بھوت اور پریت جسمانی حالت میں تو نہیں ہوتے۔
وہ تو دھوئیں کی شکل میں ہوتے ہیں ۔" آفاق شیرازی نے کھوئے
کھوئے انداز میں کہا۔

" اگرچہ کام کسی بھوت ووت کا ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا
ہے کہ اس بھوت کو آپ لوگوں سے کیا دشمنی ہے۔ ایسی دشمنی
کہ آپ کے یہاں آتے ہی وہ بھی حویلی میں آ پہنچے اور راتوں

کو دھاچوکڑی مچانے لگے — یہاں تک کہ آپ کے ایک ساتھی کو ہلاک بھی کر دیا۔ کہیں یہ کوئی پرانی دشمنی تو نہیں؟" انسپکٹر جمشید نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں جناب، بھلا کسی بھوت کو ہم سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟" آفاق شیرازی نے برا مان کر کہا۔

"مجھے تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے، جیسے اس بھوت کی آپ سے کوئی خاص دشمنی ہے اور جان عالم کے بعد آپ میں سے کسی کی باری بھی جلد ہی آنے والی ہے۔"

"نہیں نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔" عابدہ سلطانہ نے تھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"میرے اندازے غلط نہیں ہو سکتے — یہ بھوت آپ کو نہیں چھوڑے گا — اس کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ آپ اپنے تمام حالات مجھے سنا دیں — آپ لوگ دراصل کون ہیں، کیا کام کرتے ہیں، یہاں کس لیے آتے ہیں۔ آپ کے یہاں آتے ہی حویلی کے ایک برآمدے میں ایک بہت بڑا بچھو پایا گیا — پھر جان عالم کی لاش ملی۔ اس کے بعد اس کمرے میں بھی ایک بچھو ملا، آخر یہ سب کیا ہے؟"

"سیاہ بچھو، پھر ایک اور بچھو۔" عابدہ سلطانہ نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

"ہاں، سیاہ بچھو کو تو خیر مار دیا گیا۔ دوسرا بچھو البتہ آپ لوگ دیکھ سکتے ہیں — یہ دیکھیے اور مجھے بتائیے کہ یہ کیا ہے۔ یہ حویلی میں کہاں سے آ گیا۔ اس پورے قصبے میں کبھی ایسے بچھو نہیں دیکھے گئے۔"

یہ کہہ کر انہوں نے پیتل کا بچھو نکال کر ان سب کے آگے کر دیا۔ انہوں نے بچھو کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا اور پھر نواز خاطر نے تھرتھر کانپتی آواز میں کہا:

"شاید موت ہمارے تعاقب میں ہے، ہمیں یہاں سے بھاگ جانا چاہیے۔"

"افسوس تو یہی ہے کہ اب آپ لوگ یہاں سے جا بھی نہیں سکتے، جب تک کہ تفتیش مکمل نہ ہو جائے اور یہ نہ معلوم ہو جائے کہ جان عالم کو کس نے قتل کیا ہے۔ رہی بات بھوت پریت کی، تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ کسی بھوت کو قتل کرنے کے لیے خنجر استعمال کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی — اب آپ لوگ یہ کہیں گے کہ پھر خنجر کے دستے پر انسانی انگلیوں کے نشانات کیوں نہیں ملے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسے دستانے بنائے جا سکتے ہیں جن پر فرضی نشانات ڈالے جا سکیں۔" انہوں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

"اوہ!" نواب صاحب کے منہ سے نکلا: "یہ تو ہم نے سوچا بھی نہیں — تو کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ....." نواب صاحب کہتے

کہتے رک گئے۔

"جی ہاں، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جانِ عالم کو کسی بھوت پریت نے نہیں، بلکہ حویلی میں موجود افراد میں سے کسی ایک نے قتل کیا ہے۔"

"ارے نہیں" کئی آوازیں ابھریں۔

"اور اب ہمیں اس حویلی میں ایک قتل کی تفتیش کرنا ہے — آپ چاروں کو میرے سوالات کے جواب دینا ہوں گے۔ کیا آپ تیار ہیں — اگر نہیں، تو پھر آپ زیادہ بڑی الجھن میں گرفتار ہو جائیں گے. کہیے کیا کہتے ہیں؟"

"ہم ہر طرح تعاون کریں گے جناب" نواز خاطر نے فوراً کہا۔

"ایک منٹ جناب" جہان خان بول پڑا "اس کیس کا انچارج میں ہوں. آپ لوگ صرف میرے سوالات کے جوابات دیں گے — ان کا اس کیس سے کوئی تعلق نہیں"

"جہان خان، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ انسپکٹر جمشید ہمارے مہمان ہیں اور میں نے انہیں اسی سلسلے میں بلایا ہے" نواب صاحب نے تلملا کر کہا۔

"لیکن جناب، یہ قانون کا معاملہ ہے"

"ٹھیک ہے، ہم سب قانون کا احترام کریں گے، لہذا یہ

اجازت نامہ ملاحظہ فرمائیے۔ اس کی رو سے میں اپنے ملک کے کسی بھی معاملے میں دخل دے سکتا ہوں؛ تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ اس کیس میں کچھ بھی نہیں کریں گے۔ سب کچھ تو دراصل آپ ہی کریں گے — میں تو صرف آپ کا ہاتھ بٹاؤں گا" انہوں نے نرم آواز میں کہا اور اجازت نامہ کھول کر ان کے سامنے کر دیا — جہان خان کا چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ اس نے شکست خوردہ آواز میں کہا۔

"ٹھیک ہے جناب، آپ اس کیس کے سلسلے میں جو جی چاہے کر سکتے ہیں"

"تو پھر آئیے، ہم لوگ بیٹھ کر بات چیت کریں"

وہ ہال میں آ گئے — سب لوگ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ آخر انسپکٹر جمشید نے سوالات کا سلسلہ شروع کیا:

"سب سے پہلے تو یہ بتائیے کہ آپ لوگوں کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟"

"ہم چاروں آثارِ قدیمہ کے طالب علم ہیں — ہمارے استاد نے یہاں کے کھنڈرات کے بارے میں بتایا تو ہمیں یہاں آنے کا شوق چرایا۔ انہوں نے بتایا تھا کہ ان کھنڈرات کے بارے میں آج تک کوئی شخص بھی کچھ معلوم نہیں کر سکا. اگر تم چاروں کچھ معلوم کر سکو تو یہ بہت بڑا کارنامہ ہوگا؛ چنانچہ ہم ان سے تعارفی

خط لے کر یہاں چلے آئے۔ یہ بات بھی انہوں نے خود ہی بتائی تھی کہ یہاں کے نواب ان کے دوست ہیں اور یہ کہ کسی زمانے میں وہ خود بھی یہیں رہا کرتے تھے۔ ان کا نام پروفیسر ابرام ہے۔" یہاں تک کہہ کر نواز خاطر خاموش ہوگیا۔

"تو پروفیسر ابرام آپ کے دوست ہیں۔"

"ہاں، جس زمانے میں وہ یہاں رہنے کے لیے آئے تھے۔ اس زمانے میں میری ان سے دوستی ہوگئی تھی اور سچ تو یہ ہے کہ وہ بھی ان کھنڈرات کا کھوج لگانے کے لیے آئے تھے۔ رات کا وقت تو حویلی میں گزارتے، دن کا تمام وقت کھنڈرات میں۔"

"اوہ۔" انسپکٹر جمشید کے منہ سے نکلا: "وہ کتنا عرصہ یہاں رہے؟"

"تقریباً چھ ماہ۔ اس کے بعد مایوس ہو کر چلے گئے۔ جاتے وقت انہوں نے کہا تھا۔ میں کوشش کے باوجود ان کھنڈرات کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کر سکا، لیکن میں نوجوانوں کی ایک جماعت ادھر روانہ کروں گا، وہ ضرور اس کا کھوج لگا کر رہے گی۔" انہوں نے بتایا۔

"ہوں، تو آپ کو انہی پروفیسر نے بھیجا ہے۔"

"جی ہاں۔" عابدہ بولی۔

"وہاں رہتے ہوئے بھی آپ آثار قدیمہ کا کھوج لگاتے رہے

ہیں۔"

"جی ہاں، پروفیسر ابرام کے ساتھ ساتھ ہم نے بہت کام کیا ہے۔"

"کھنڈرات میں کام کرتے ہوئے آپ کو کئی دن ہو گئے، کیا کامیابی کی کوئی امید ہے؟"

"جی ہاں، ہم پُر امید ہیں۔"

"ٹھیک ہے، آپ لوگ اپنا کام جاری رکھیں، لیکن قصبے سے فرار ہونے کی کوشش نہ کیجیے گا، جب تک کہ جان عالم کے قتل کا راز نہ معلوم ہو جائے اور قاتل گرفتار نہ ہو جائے۔"

"جی بہتر، ہم نہیں بھاگیں گے۔" عابدہ سلطانہ بولی۔

"آپ جس علاقے سے آئے ہیں، کیا وہاں سیاہ رنگ کے بڑے بڑے بچھو پائے جاتے ہیں؟" محمود نے سوال کیا۔

"جی ہاں، کثرت سے پائے جاتے ہیں اور اگر یہ کسی کو کاٹ لیں تو وہ شخص فوری طور پر ہلاک ہو جاتا ہے۔ یہ بات مشہور ہے کہ یہ کالے ناگ سے بھی زیادہ خطرناک ہیں۔"

"تو یہ پیتل کا بچھو آپ میں سے کسی کا نہیں؟" فاروق بولا۔

"میرے خیال میں تو یہ جان عالم کا ہی ہے۔ میں نے ایک دو بار اس کے پاس دیکھا بھی تھا۔" آفاق شیرازی نے کہا۔

"خیر، یہ میرے پاس رہے گا اور اگر آپ میں سے کسی کے

پاس کوئی زندہ بچھو ہو تو وہ میرے حوالے کر دیں۔" انسپکٹر جمشید سرد آواز میں بولے۔

"زندہ بچھو، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ بھلا ہمارے پاس زندہ بچھو کا کیا کام؟" نواز خاطر نے کہا۔

"یہ تو خیر نہ کہیے۔ ایک زندہ بچھو نواب صاحب خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں، بلکہ مار بھی چکے ہیں۔ اس کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں، جب کہ اس علاقے میں ایسے بچھو سرے سے نہیں پائے جاتے اور آپ جہاں سے آئے ہیں، وہاں ایسے بچھو ملتے ہیں۔"

"اوہ، بھوت۔" عابدہ سلطانہ نے سرسراتی آواز میں کہا۔

"اوہ بھوت، کیا مطلب؟ کیا آپ کو کوئی بھوت نظر آ رہا ہے؟" فاروق نے گھبرا کر کہا۔

"جی نہیں، میرا خیال ہے، وہ بچھو ضرور وہ بھوت اپنے ساتھ لایا ہے، جس نے جان عالم کو ہلاک کیا ہے۔"

"اس خیال کو ذہن سے نکال دیں۔ جان عالم کو کسی بھوت نے نہیں، انسان نے ہلاک کیا ہے اور میں اس کے قاتل کو گرفتار کر کے دکھاؤں گا۔"

"آپ کچھ بھی کہیں، میرا دل تو مانتا نہیں۔" عابدہ سلطانہ بولی۔

"آپ کا دل مانے یا نہ مانے، حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

میں آپ تینوں کو ہوشیار رہنے کی ہدایت کرتا ہوں۔ مجھے آپ میں سے دو کی زندگی خطرے میں نظر آ رہی ہے۔ اور ہاں، آپ کی یہ ملازمہ کون سی زبان جانتی ہے؟"

"صرف پہاڑی زبان۔"

"اسے ساتھ لانے کی کیا ضرورت تھی۔"

"چلتے وقت یہ معلوم نہیں تھا کہ نواب صاحب کے ہاں ہمیں کیا کیا آسائشیں ملیں گی۔ میں نے سوچا تھا کہ ہمیں کھانا وغیرہ خود تیار کرنا پڑا تو ہمارا بہت سا وقت تو ایسے کاموں میں صرف ہو جائے گا، لہٰذا سراکی کو ساتھ لے جانے کی تجویز ان لوگوں کے سامنے رکھی۔ انھوں نے بھی اس تجویز کو پسند کیا۔ سراکی کو ہم نے پہلے ہی ملازم رکھا ہوا تھا۔ بے چاری کا نہ کوئی آگے نہ پیچھے، لہٰذا اس نے فوراً ہمارے ساتھ آنے کی ہامی بھر لی۔"

"اگر میں پہاڑی زبان جانتا تو ضرور اس سے بھی چند سوال کرتا۔" انسپکٹر جمشید نے نوکرانی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو آپ ہماری معرفت سوال کر سکتے ہیں۔ ہم آپ کا سوال اس تک اور اس کا جواب آپ تک پہنچاتے رہیں گے۔"

"نہیں، اس طرح مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ خیر، اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اب آپ لوگ آرام کریں۔ انشاء اللہ ایک آدھ دن میں جان عالم کے قاتل کو گرفتار کر لیا جائے گا۔ اس کے بعد آپ آزاد

ہوں گے، اگر واپس جانا چاہیں تو بھی اور اگر یہیں ٹھہر کر اپنا کام ختم کرنا چاہیں تو بھی۔" یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید اٹھ کھڑے ہوئے۔

رحیم نے ان کے لیے دو کمرے درست کر دیے تھے، لیکن چونکہ کمرے بہت بڑے تھے۔ اس لیے انہوں نے ایک ہی کمرے میں سونے کا پروگرام بنایا۔

"کم از کم میں ایک بات پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں۔" محمود نے اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"کہو بھائی تمہیں روکا کس نے ہے۔" فاروق نے سرد آہ بھری۔

"یہ کہ جان عالم کا قاتل اس قصبے کا کوئی آدمی نہیں ہو سکتا، میرا مطلب ہے، نواب صاحب، ان کے بیٹوں، بیٹوں کی بیویوں یا ان کے ملازمین میں سے کوئی نہیں ہو سکتا۔"

"لیکن یہ ناممکن تو نہیں۔" فرزانہ بولی۔

"تقریباً تقریباً ناممکن ہی ہے، کیوں ابا جان؟"

"ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے، جو کچھ بھی چکر ہے، وہ ان چاروں کے درمیان ہے۔ میں حیران ہوں کہ ان میں سے کسی ایک کو اپنے ایک ساتھی کو ہلاک کرنے کی کیا ضرورت تھی۔" انہوں نے کہا۔

"اور آپ تو ان تینوں کو بھی چوکس رہنے کے لیے کہہ رہے تھے۔"

"ہاں، جس نے جان عالم کو ہلاک کیا ہے، وہ ان میں سے باقی دو کو بھی ہلاک کر سکتا ہے۔"

"عجیب سا معاملہ ہے۔"

سونے کے وقت تک وہ کسی خاص نتیجے پر نہ پہنچ سکے، پھر گہری نیند سے ان کی آنکھ اس وقت کھلی جب برآمدوں میں بھوتوں کا پروگرام شروع ہو گیا۔ انہوں نے سنا، برآمدوں سے دھماچوکڑی کی زبردست آوازیں آ رہی تھیں۔ بے شمار برتن ٹوٹ رہے تھے، پھوٹ رہے تھے۔ کودنے اور پھاندنے کی آوازیں بھی ان آوازوں میں شامل تھیں۔ دھینگا مشتی کی آوازیں بھی شامل تھیں۔ چاروں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ انسپکٹر جمشید نے چپل پہنتے ہوئے کہا:

"آؤ بھئی، ذرا ان بھوتوں سے ملاقات بھی کر ہی لیں۔"

چاروں کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلے، لیکن اسی وقت دھماچوکڑی کی آوازیں بند ہو گئیں۔ انہوں نے دیکھا، برآمدے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ ابھی وہ برآمدوں میں ٹہلتے پھر ہی رہے تھے کہ انہوں نے آفاق شیرازی کی لرزتی آواز سنی:

"اف خدا، یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

○

دوسری صبح ناشتے کے بعد عابدہ سلطانہ اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ کھنڈرات کی طرف روانہ ہو گئی۔ انسپکٹر جمشید نے ناشتے کے بعد

ان سے کہا:

"آؤ بھئی، ہم ذرا ان کی نوکرانی سراکی سے چند باتیں کرلیں۔"

"لیکن ابا جان، آپ تو ان کی زبان جانتے ہی نہیں۔" فاروق بولا۔

"تم تو احمق ہو، ہم اس سے اشاروں میں باتیں کرسکتے ہیں۔" فرزانہ نے جھلا کر کہا۔

"کیوں ابا جان، آپ کا کیا خیال ہے؟" فاروق نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔

"کس بارے میں بھئی؟"

"یہی کہ میں احمق ہوں یا نہیں۔"

"نہیں تم احمق نہیں ہو۔ تمہارا خیال بالکل ٹھیک ہے۔"

"جی کیا مطلب، فاروق نے اپنا کوئی خیال کب پیش کیا ہے۔ اس نے تو صرف یہ کہا تھا کہ آپ تو پہاڑی زبان جانتے ہی نہیں۔" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"اس جملے سے فاروق کا مطلب یہی کہنا تھا: گویا آپ پہاڑی زبان جانتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"اوہو، یہ فاروق اتنا عقل مند کب سے ہو گیا۔" فرزانہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"جب سے تمہارا سایا مجھ سے دور ہٹا ہے۔" فاروق نے بھی جلے بھنے انداز میں کہا۔

وہ سراکی کے کوارٹر تک پہنچے۔ محمود نے دستک دی۔ دروازہ فوراً ہی کھلا۔ سراکی نے انہیں حیران ہو کر دیکھا، پھر منہ سے کچھ کہا اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، پھر اس نے اندر داخل ہونے کے لیے انہیں راستہ دیا اور وہ اندر داخل ہونے کے بعد چارپائی پر بیٹھ گئے۔ وہ ان کے سامنے ایک سٹول پر بیٹھ گئی۔ انسپکٹر جمشید کافی دیر تک اس سے باتیں کرتے رہے اور پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہیں لے کر باہر نکلے۔ ان کی بے چینی عروج پر تھی۔ باہر نکلتے ہی فرزانہ نے کہا:

"ابا جان، کچھ ہمیں بھی تو بتائیے۔"

"ہاں ضرور، سراکی بہت پریشان ہے۔ جب سے اس نے ان چاروں کی ملازمت کی ہے۔ پریشان ہی ہے۔ ان کی حرکتیں انتہائی عجیب وغریب ہیں۔ یہ اکثر آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ ان میں تو تو میں میں تو ہوتی ہی رہتی ہے۔ نوبت کبھی کبھی مار پیٹ پر بھی آجاتی ہے۔ کبھی کبھی یہ رات گئے تک بیٹھے آپس میں باتیں کرتے رہتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا سامان الگ ہے۔ ہر ایک اپنا سامان دوسرے سے بچا کر رکھتا ہے۔ اپنے سوا کسی کا ہاتھ لگنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ خدا جانے ان کے آپس کے تعلقات کیسے ہیں۔ کبھی کبھی تو انتہائی گہرے دوست معلوم ہوتے ہیں، اور کبھی جانی دشمن۔ وہ بہت تنگ دستی کے دن گزار رہی تھی۔

ورنہ ان کی ملازمت کبھی نہ کرتی۔ یہاں بھی اسے مجبوراً آنا پڑا۔ اپنی غیر حاضری کے دوران انہوں نے اسے تنخواہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ یہ ان کے ساتھ یہاں آ جائے۔ اسی صورت میں یہ اسے تنخواہ دیں گے۔" یہاں تک کہہ کر انسپکٹر جمشید خاموش ہو گئے۔

"اُف خدا، آخر یہ چکر کیا ہے۔ یہ تو معاملہ پراسرار سے پراسرار تر ہوتا جا رہا ہے۔"

"میرا خیال ہے، ہمیں بھی کھنڈرات کی سیر کو نکل جانا چاہیے۔ ذرا دیکھیں تو سہی، یہ لوگ وہاں کیا کر رہے ہیں۔"

"اور جہان خان نے آپ کو قصبہ رومان چند پر کتاب بھی نہیں بھجوائی۔" فرزانہ نے یاد دلایا۔

"بھجوا دے گا — میں اس کے بغیر بھی کام چلا لوں گا۔ تم فکر نہ کرو۔"

"ان چاروں کے سامان کی تلاشی — یہ بھی تو دیکھنا چاہیے کہ یہ لوگ اپنا سامان ایک دوسرے سے بچا کر کیوں رکھنا چاہتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے، سامان بھی دیکھنا ہو گا، لیکن اس طرح کہ ہم میں سے دو یہاں رہ کر سامان دیکھیں گے اور دو کھنڈرات کی طرف جائیں گے، تاکہ اگر وہ لوگ واپس آنے لگیں تو ہم ان سے پہلے

ہی لوٹ کر انہیں خبردار کر دیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"تجویز اچھی ہے، لیکن ہم میں سے کون کون یہاں رہے گا۔ یہ فیصلہ آپ کریں۔" محمود بولا۔

"فاروق اور فرزانہ یہاں رہ کر سامان کی تلاشی لیں۔ میں اور محمود کھنڈرات تک ہو آتے ہیں۔"

"فاروق کو میرے ساتھ نہ کیجیے ابا جان، جہاں فاروق ہو، وہاں کوئی کام نہیں ہو سکتا۔" فرزانہ نے جلدی سے کہا۔

"خیر ایسی تو کوئی بات نہیں۔ جب فاروق کام کرنے پر اتر آتا ہے، تو بعض اوقات ہم دونوں کو بھی پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔" محمود بولا۔

"اتر آئے، تب نا۔ یہ کیا معلوم کہ یہ کام کرنے پر اترا ہوا ہے یا نہیں —" فرزانہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"خیر خیر لڑو نہیں۔ محمود اور فاروق یہاں رہ کر سامان کی تلاشی لیں۔ میں اور فرزانہ وہاں ہو آتے ہیں۔"

"لیکن ابا جان، میں ان کھنڈرات کو دیکھنے کے لیے بے چین ہوں۔" محمود نے کہا۔

"بھئی فکر کی کون سی بات ہے۔ تم دونوں کو بھی کھنڈرات دیکھنے کا پورا پورا موقع دیا جائے گا۔" وہ مسکرائے۔

"چلیے ٹھیک ہے — آپ روانہ ہو جائیں۔ ہم ان کے کمرے

کا رخ کرتے ہیں۔"

"سامان تو ان کا الگ الگ کمرے میں ہو گا اور دروازوں پر تالے بھی لگے ہوں گے، لیکن میرا خیال ہے کہ نواب صاحب کے پاس ان کے تالوں کی دوسری چابیاں بھی ہوں گی۔"

"آپ فکر نہ کریں، ہم کسی نہ کسی طرح کھول ہی لیں گے۔"

انسپکٹر جمشید اور فرزانہ حویلی سے نکل کر کھنڈرات کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ انہوں نے پیدل ہی جانے کا پروگرام بنایا تھا، کیونکہ کھنڈرات حویلی سے زیادہ دور نہیں تھے۔ ادھر محمود اور فاروق جان عالم کے کمرے کے دروازے پر پہنچے۔ یہاں واقعی ایک تالا لگا ہوا تھا۔

"جاؤ فاروق، نواب صاحب سے ان تالوں کی چابیاں لے آؤ۔ اتنے میں میں اپنی چابیاں آزمانے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"تو تم کیوں نہیں جاتے۔ میں اپنی چابیاں لگا کر دیکھ لیتا ہوں۔"

"فرزانہ ٹھیک کہتی تھی کہ جہاں تم ہو، وہاں کام نہیں ہو سکتا۔"

"لیکن تم نے تو کہا تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ جب میں کام کرنے پر اتر آتا ہوں تو بعض اوقات تم دونوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیتا ہوں۔"

"میرا دماغ چل گیا تھا، جو میں نے ایسا کہا تھا۔" محمود نے پیر

پٹخ کر کہا اور چابیاں لینے چلا گیا۔ فاروق شریر انداز میں مسکراتا ہوا تالے پر جھک گیا۔ اس نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر اس میں سے ایک چابی لگائی۔ جس وقت محمود چابیاں لے کر واپس لوٹا، فاروق اس کمرے کا دروازہ کھولے کھڑا تھا۔

"دھت تیرے کی، تم نے تو کھول بھی لیا۔"

"اسی لیے تو میں چابیاں لینے نہیں جا رہا تھا، کیونکہ میں جانتا تھا، میری چابیوں کے آگے یہ تالے کیا اٹکیں گے۔" اس نے مصنوعی اکڑ سے کہا۔

"اچھا آؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم باتیں کرتے رہ جائیں اور وہ لوگ واپس آ جائیں۔"

دونوں نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ پورے کمرے میں ایک سوٹ کیس کے سوا کچھ بھی نہیں تھا؛ گویا جان عالم کا جتنا بھی سامان تھا، بس اس سوٹ کیس میں تھا۔

"چلو بھئی، اب اسے بھی کھولو۔" محمود بولا۔

"ہر چیز کھولنے کا میں نے ٹھیکہ نہیں لیا۔ کوئی چیز تم بھی کھول کر دکھاؤ۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"تم تو اس طرح کہہ رہے ہو، جیسے دس پندرہ دروازوں اور سوٹ کیسوں کے تالے کھول چکے ہو۔" محمود جل بھن کر بولا۔

"اب تم وقت ضائع کر رہے ہو، نام صرف میرا بدنام ہو گا۔"

فاروق نے بھی بھنّا کر کہا۔
"اچھا اچھا، کاٹ کھانے کو نہ دوڑو۔ لو میں ابھی اسے کھولے دیتا ہوں۔"
محمود گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اس میں چابیاں لگانے لگا۔ آخر چند منٹ کی کوشش کے بعد وہ اسے کھولنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ اس نے دھک دھک کرتے دل کے ساتھ ڈھکنا اوپر اٹھا دیا۔ انہوں نے دیکھا، سوٹ کیس میں کپڑوں کے چند جوڑے، شیو کا سامان، روزمرہ زندگی کی کچھ چیزیں قرینے سے رکھی تھیں۔ پلاسٹک کی بنی ایک کالے رنگ کی ڈبیا بھی تھی۔ اس میں بہت باریک سوراخ تھے۔ جیسے وہ کوئی ننھا سا ٹرانسسٹر ہو۔
"ایسا ٹرانسسٹر کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔" فاروق بڑبڑایا۔
"میرے خیال میں تو یہ ٹرانسسٹر ہے ہی نہیں۔" محمود نے کہا۔
"تو اور کیا چیز ہے؟"
محمود نے اس ڈبیا کو اٹھا لیا۔ یہ مستطیل شکل کی تھی۔ ڈبیا کو ہاتھ میں لیتے ہی اسے کچھ عجیب سا احساس ہوا۔ اس نے جلدی سے ڈبیا واپس رکھ دی۔
"کیوں کیا ہوا، کیا اسے کھول کر نہیں دیکھو گے؟"
"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" محمود نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کیا کہا، ڈر اور تمہیں لگ رہا ہے؟ یہ ڈر کو کیا ہوا۔ کہیں پاگل تو نہیں ہو گیا۔" اس نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔
"یار، مذاق نہ کرو۔" محمود نے پریشان آواز میں کہا۔
"تم تو سچ مچ ڈرے ہوئے لگتے ہو۔ ٹھہرو، میں کھولتا ہوں اسے۔"
"ارے ارے، نہ کھولو۔ فاروق رک جاؤ۔"
لیکن اتنی دیر میں فاروق ڈبیا کی کمانی دبا چکا تھا۔ ڈھکن یک دم اوپر اٹھ گیا اور اس کے ساتھ ہی فاروق نے ایک زوردار چیخ ماری اور اچھل کر پیچھے گرا۔ یہی حال محمود کا بھی ہوا۔

گہرا چکر

انسپکٹر جمشید کو کھنڈرات کا راستہ یاد تھا۔ اس لیے کسی سے پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی — پیدل چلتے دونوں ان کے سامنے پہنچ گئے — یہ بہت طویل سلسلہ تھا، یوں لگتا تھا جیسے پوری ایک بستی کبھی یہاں آباد تھی۔ اب تو جگہ جگہ ستون، ادھ گری دیواریں، چھتیں، فرش، ملبے کے ڈھیر ٹیلوں کی صورت میں کھڑے تھے اور کہیں کہیں گھاس پھونس بھی اگ آیا تھا؛ تاہم ستون، دیواروں اور فرشوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ کوئی بہت بڑی عمارات تھیں۔ ستونوں کی موٹائی سے بھی یہی بات نظر آتی تھی۔ جوں ہی وہ نزدیک پہنچے، انہوں نے کدال چلنے کی آواز سنی۔

"یہ لوگ تو شاید کھدائی کر رہے ہیں۔" فرزانہ نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں، آثارِ قدیمہ والے کھدائیاں کر کر کے بعض اوقات شہر دریافت کر لیتے ہیں۔ کھدائی کے دوران انہیں اس زمانے کی ایسی

چیزیں مل جاتی ہیں، جن سے ان کھنڈرات کی تاریخ معلوم کرنے میں بہت مدد ملتی ہے۔"

"لیکن سننے میں تو یہ آیا ہے کہ ان کھنڈرات کے بارے میں آج تک کوئی بھی شخص کھوج نہیں لگا سکا۔"

"ہاں، یہی کہا جاتا ہے۔ پروفیسر ابرام کے بارے میں بھی نواب صاحب نے یہی بتایا ہے کہ وہ بھی ناکام لوٹ گئے تھے۔ اس بات پر مجھے حیرت ہے۔ انہیں تو کامیابی ہوئی نہیں تھی اور انہوں نے اپنے شاگردوں کو بھیج دیا، بھلا یہ شاگرد کیا کر سکیں گے۔" وہ بولے۔

"بعض اوقات ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ شاگرد استاد سے دو ہاتھ آگے نکل گئے۔"

"ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے — خیر، آؤ دیکھتے ہیں۔"

وہ اس طرف بڑھنے لگے جس طرف سے کھدائی کی آوازیں آ رہی تھیں۔ آخر انہیں عابدہ ایک طرف کپڑا بچھا کر بیٹھی نظر آئی۔ اور وہ دونوں کہیں گہرائی میں کھدائی میں مصروف تھے۔ کدالیں متواتر چل رہی تھیں — دونوں ٹیلوں کی اوٹ لیتے دبے پاؤں ان سے نزدیک ہوتے چلے گئے۔

"جان عالم کی موت کو میں بھول نہیں سکتا۔ اسے ضرور تم دونوں میں سے کسی ایک نے قتل کیا ہے۔" آفاق شیرازی کہہ رہا تھا —

" تمہارا دماغ چل گیا ہے ۔ بالکل یہی بات میں یا عابدہ بھی کہہ سکتی ہے، لیکن اسے ہم تینوں میں سے کسی نے بھی قتل نہیں کیا" نواز خاطر نے جھلا کر کہا۔ ان کی آوازیں کنوئیں سے آتی معلوم ہو رہی تھیں۔

" تو پھر، آخر وہ خنجر اس کے پیٹ میں کس نے اتارا؟"

" اس بھوت نے جو ہمارے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا ہے۔ ہمیں خود کو اس سے بچا کر رکھنا چاہیے۔ نہیں تو وہ ہمارے ساتھ بھی یہی سلوک نہ کر بیٹھے"

" کم از کم آج رات میں تو تمہارے ساتھ سوؤں گا نہیں" آفاق شیرازی بولا۔

" تو ہم ہی کونسا تمہارے ساتھ سونے کے لیے تیار ہیں" نواز خاطر نے بُرا سا منہ بنایا۔

" میں بھی آج الگ کمرے میں سونا پسند کروں گی" عابدہ بولی۔

"کیوں، کیا تمہیں مجھ سے خطرہ ہے" نواز خاطر ہنسا۔

" کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے، اسے تم نے ہی قتل کیا ہو" عابدہ بولی۔

" ہونے کو تو تم بھی اس کی قاتل ہو سکتی ہو۔ نواز خاطر نے جھلا کر کہا۔

" اس طرح لڑنے بھڑنے کا کوئی فائدہ نہیں ۔ ہمارا کام صرف

دو دن کا رہ گیا ہے۔ دو دن بعد ہم کامیابی کو چھو لیں گے" آفاق شیرازی بولا۔

" ہم ایک بات تو بھول ہی گئے" نواز خاطر نے حیران ہو کر کہا۔

" کون سی بات ؟"

" قاتلہ ہماری ملازمہ سرا کی بھی تو ہو سکتی ہے"

" لیکن بھلا اسے قتل کرنے کی کیا ضرورت، اور پھر اسے ہمارے آپس کے معاملات کی کیا خبر" نواز خاطر نے نفی میں سر ہلایا۔

" ہوں، بات تو یہ بھی ٹھیک ہے، لیکن کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ ہماری باتیں چوری چھپے سنتی رہی ہو"

" دل نہیں مانتا ؛ بہر حال ہم اس کی طرف سے بھی ہوشیار رہیں گے" عابدہ سلطانہ نے فکرمندانہ لہجے میں کہا۔

" ایک وہ انسپکٹر صاحب آ دھمکے ہیں، نہ جانے کیوں مجھے ان سے ڈر لگتا ہے" آفاق شیرازی بولا۔

" تمہارا اشارہ انسپکٹر جمشید کی طرف ہے"

" ہاں، سنا ہے، بہت چالاک آدمی ہے"

"پروا نہ کرو۔ اپنے کام سے کام رکھو" نواز خاطر نے کہا۔

تھوڑی دیر کے لیے خاموشی طاری ہو گئی۔ کدالیں چلتی رہیں۔ وہ ساتھ ساتھ مٹی نکالتے جا رہے تھے۔ انسپکٹر جمشید اب اوٹ سے نکلے۔ فرزانہ نے بھی ان کا ساتھ دیا اور دونوں سامنے آ گئے۔ عابدہ

انہیں دیکھ کر ٹھٹکی۔

"ہیلو، یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"جی، کھدائی ہو رہی ہے۔ ہم یہ کھوج لگانے میں مصروف ہیں کہ آخر یہ کھنڈرات کس کے زمانے کے ہیں، کس سن کے ہیں؟" عابدہ نے جلدی سے کہا۔ ان کی آوازیں نواز خاطر اور آفاق شیرازی تک بھی پہنچ گئیں، کیونکہ اسی وقت نواز خاطر نے گڑھے سے سر ابھارا تھا۔

"مجھے حیرت ہے، آپ لوگوں نے آج جان عالم کی لاش کے واپس ملنے کا انتظار بھی نہیں کیا۔ پہلے اس کے کفن دفن کا انتظام تو کر لیا ہوتا۔" ان کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔

"جو شخص مر چکا، وہ مر چکا۔ اس کی خاطر ہم اپنا وقت کیوں ضائع کریں۔ یوں بھی جہان خان نے بتایا تھا کہ لاش دوپہر سے پہلے واپس نہیں ملے گی۔ ہم دوپہر کے وقت حویلی پہنچ جائیں گے اور اسے دفنا دیں گے۔" آفاق شیرازی نے اندر سے کہا۔

"یہاں آپ کو کام کرتے کتنے دن ہو چکے ہیں؟" فرزانہ نے پوچھا۔

"تقریباً پندرہ دن۔"

"پھر پندرہ دن میں آپ نے کیا کامیابی حاصل کی؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ابھی تک کوئی خاص نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے ہمیں بھی پروفیسر ابرام کی طرح ناکام واپس لوٹنا پڑے گا۔" آفاق شیرازی نے کہا۔

"اچھا بھئی، ہم بھی ذرا ان کھنڈرات میں گھوم پھر کر سیر کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں۔"

"نہیں، بھلا ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔" عابدہ بولی اور وہ دونوں آگے بڑھ گئے۔

"کس قدر عجیب لوگ ہیں۔ ان کا ایک ساتھی ہلاک ہو چکا ہے اور یہ اسے دفن کیے بغیر یہاں کھدائی کرنے آ گئے ہیں۔" فرزانہ نے حیران ہو کر کہا۔

"یہ دنیا ہی بہت عجیب جگہ ہے فرزانہ۔ یہاں لوگ دولت کی خاطر اپنے بھائی کو قتل کر دیتے ہیں۔ اپنے باپ کو قتل کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ ماں کو بھی قتل کر دیتے ہیں۔ میں جانتا ہوں، قاتل ان تینوں میں سے ہی کوئی ایک ہے، لیکن اس کے باوجود یہ بے خوف ہو کر یہاں کھدائی کر رہے ہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ آثار قدیمہ کی کھدائی کی نیت سے نہیں آئے، بلکہ کسی اور ہی نیت سے آئے ہیں اور مجھے ایسا خیال آتا ہے کہ ان کے پروفیسر بھی ایک زمانہ پہلے اسی غرض سے یہاں آئے تھے، لیکن ناکام لوٹ گئے تھے۔ اب انہوں نے اپنے شاگردوں کو بھیجا ہے۔"

"اوہ، تو آپ کے خیال میں یہ کس لیے آئے ہیں؟" فرزانہ نے بے تابی کے عالم میں کہا۔

"ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا، ہاں اندازہ ضرور لگا سکتا ہوں۔ تم بھی اندازہ لگانے کی کوشش کرو۔"

"جی بہتر۔"

انہوں نے پورے کھنڈرات کا ایک چکر لگایا اور واپس لوٹے۔ جب وہ اس جگہ پہنچے، جہاں وہ لوگ کھدائی کر رہے تھے تو انہیں سناٹے کا احساس ہوا۔ انہوں نے تیزی سے آگے بڑھ کر دیکھا اور حیران رہ گئے۔ وہ تینوں جا چکے تھے۔

"ارے، ان کا واپس جانے کا پروگرام تو دوپہر کے وقت تھا۔" فرزانہ کے منہ سے نکلا۔

"شاید وہ صرف ہم دونوں کو یہاں دیکھ کر ٹھٹک گئے ہوں گے۔ اور انہیں یہ خطرہ محسوس ہوا ہوگا کہ کہیں ہمارے باقی دونوں ساتھی ان کے سامان کی تلاشی نہ لینا شروع کر دیں۔"

"اوہ۔" فرزانہ کے منہ سے نکلا، پھر اس نے گھبرا کر کہا: "تو پھر آئیے، ہم ان سے پہلے حویلی میں پہنچنے کی کوشش کریں۔"

"نہیں، اب اس کی ضرورت نہیں۔ میرا خیال ہے۔ وہ لوگ ہمارے یہاں سے آگے بڑھتے ہی حویلی کی طرف روانہ ہو گئے تھے، لہذا اب تک پہنچ بھی چکے ہوں گے۔ آؤ، ہم ذرا اس گڑھے کا

جائزہ لے لیں۔" انسپکٹر جمشید بولے اور گڑھے میں اترنے لگے۔ فرزانہ نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ گڑھا تقریباً دس فٹ گہرا کھودا جا چکا تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح گڑھے کی تہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ دوسرا لمحہ چونکا دینے والا تھا۔ گڑھے کی تہہ میں ایک سرنگ کا دہانہ نظر آ رہا تھا۔ سرنگ اتنی چوڑی تو ضرور [illegible] اس میں ایک آدمی رینگ کر داخل ہو سکتا تھا، لیکن سرنگ نہ [illegible] کب سے بند پڑی تھی۔ اس کے اندر داخل ہونے والا فوری [illegible] دم گھٹ کر مر سکتا تھا۔

"سرنگ کی دریافت کے بعد انہوں نے شاید ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا اور واپس چلے گئے۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے، پھر انہوں نے جیب سے پنسل ٹارچ نکالی اور اس کی روشنی سرنگ کے اندر ڈالی، لیکن دور دور تک سرنگ ہی نظر آئی۔ اس کا سرا نظر نہیں آ سکا۔

"فرزانہ، یہ تو کوئی بہت ہی گہرا چکر معلوم ہوتا ہے۔" انسپکٹر جمشید نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

○

محمود اور فاروق پھٹی پھٹی آنکھوں سے ڈبیا میں کلبلانے والے تین بچھوؤں کو دیکھ رہے تھے۔ ڈبیا کھلتے ہی فاروق نے

اسے سوٹ کیس پر گرا دیا تھا۔ اتفاق کی بات کہ ڈبیا بالکل سیدھی گری تھی اور بچھو ابھی تک اسی میں تھے۔

"اف خدا، تین اور بچھو۔" محمود کے منہ سے لرزتی آواز میں نکلا۔

"ہم بال بال بچے، یا خدا تیرا شکر ہے۔" فاروق نے کہا۔

"ہاں، لیکن ہم اب ان کا کیا کریں؟" محمود بولا۔

"ہمیں کسی نہ کسی طرح اس ڈبیا کو بند کر دینا چاہیے۔ اسی صورت میں ہم ان سے محفوظ رہ سکتے ہیں، اور سوٹ کیس کی تلاشی لے سکتے ہیں۔" فاروق نے کہا۔

"ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو۔" یہ کہہ کر محمود نے جیب سے اپنا قلم نکال لیا اور سوٹ کیس کی طرف قدم بڑھائے۔

"کیا ارادہ ہے۔" فاروق نے گھبرا کر کہا۔

"اس سے ڈبیا کا ڈھکنا گرا دوں گا۔"

"دیکھ لو، کہیں کوئی بچھو ڈنک نہ مار دے اور ہم تمہیں روتے نہ رہ جائیں۔"

"بھئی، یہ بچھو ہیں، سانپ نہیں جو اچھل کر ڈس لیں گے، جب تک ان کے ڈنگ کے قریب ہاتھ نہیں جائے گا، کوئی خطرہ نہیں۔" یہ کہہ کر اس نے پین کو ایک سرے سے چٹکی میں پکڑا اور پوری احتیاط سے ڈبیا کے ڈھکنے کی طرف ہاتھ لے جا کر دھکا لگایا۔

ڈھکنا فوراً ڈبیا پر گرا۔ کلک کی آواز بھی آئی۔

"میرا خیال ہے، ڈبیا پوری طرح بند ہوگئی ہے۔ یہ خود بخود بند ہونے والی ہوگی۔ اب بغیر کمانی دبائے نہیں کھلے گی۔"

"پھر بھی ہمیں احتیاط کرنی چاہیے۔"

"ٹھیک ہے، تو پھر تم مجھے اپنا قلم بھی دے دو۔"

"کیوں دے دوں۔ مجھے اپنا قلم بہت پسند ہے۔" فاروق ایک قدم پیچھے ہٹا۔

"اوہو، بھئی میں دونوں سے اس ڈبیا کو پکڑ کر سوٹ کیس سے باہر گرا دوں گا۔ اس کے بعد ہم ان بچھوؤں سے بالکل محفوظ ہوں گے۔"

"اوہ، بات تو ٹھیک ہے، پھر تو یہ لو قلم۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

محمود نے دونوں ہاتھوں میں ایک ایک قلم سنبھالا اور ان کی مدد سے ڈبیا کو اوپر اٹھا کر فرش پر ٹکا دیا۔ پھر قلم کی مدد سے اسے کافی دور کر دیا۔ مزید احتیاط یہ کی کہ اس کے اوپر ایک گلاس اٹھا کر رکھ دیا۔ اب دونوں سوٹ کیس کی طرف متوجہ ہوئے۔ انہوں نے کپڑے نکال نکال کر فرش پر ڈھیر کر دیے۔ سوٹ کیس میں کپڑوں کے سوا کوئی چیز نہ ملی، لیکن ابھی انہوں نے اس کی اندرونی جیبوں کو نہیں دیکھا۔ اب اندرونی جیبوں

کی باری آئی — فاروق کی انگلیوں نے کسی کاغذ کو چھوا — اس نے چونک کر کاغذ کو باہر کھینچ لیا — یہ بہت میلا سا کاغذ تھا، اس کا رنگ زرد تھا، تہہ کیا ہوا تھا۔ دونوں نے جوش کی ایک کیفیت محسوس کی۔ کاغذ کی تہہ کو کھول ڈالا — دوسرے ہی لمحے وہ چونک اٹھے — کاغذ مستطیل شکل کا تھا، لیکن دو طرف سے پھٹا ہوا تھا — دو طرف سے پھٹے ہونے کا مطلب یہ تھا کہ وہ کسی کاغذ کا چوتھا حصہ تھا، یعنی ایک بڑے مستطیل کاغذ کے چار ٹکڑے کیے گئے تھے۔ ان میں سے ایک یہ تھا۔ یہ اندازہ لگانے کے بعد انھوں نے کاغذ کی تحریر پر نظریں دوڑائیں۔

اس پر آڑی ترچھی سی لکیریں بنی ہوئی تھیں۔ تیروں کے چند نشانات بھی مختلف سمتوں میں اشارا کر رہے تھے۔ ایک کونے پر سنہری رنگ کا ایک بچھو بنا تھا — کاغذ پر صرف یہی ایک چیز سنہری رنگ کی تھی۔ باقی تمام لکیریں اور تیروں کے نشانات سیاہ رنگ کے تھے۔

وہ چند منٹ تک اس نقشے کو دیکھتے رہے، لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا — سمجھ میں آتا بھی کیسے — یہ تو ایک نقشے کا چوتھا حصہ تھا۔ اگر مکمل نقشہ ان کے سامنے ہوتا تو اس صورت میں تو کچھ سمجھ میں آنے کا امکان بھی تھا، کیونکہ نقشے ذرا مشکل ہی سمجھ میں آیا کرتے ہیں —

"کیا یہ کسی خزانے کے نقشے کا حصہ ہے۔" محمود بڑبڑایا۔

"کچھ کہا نہیں جا سکتا — لیکن ہم وقت کیوں ضائع کر رہے ہیں۔ اس نقشے کو جیب میں رکھو — بچھوؤں کی ڈبیا کو میں رومال میں لپیٹتا ہوں۔ ابھی ہمیں باقی تین کمروں کا جائزہ بھی لینا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہمارے جائزہ لینے سے پہلے وہ لوگ واپس آ جائیں۔" فاروق نے جلدی جلدی کہا۔

محمود نے سر ہلایا اور نقشہ جیب میں رکھ لیا۔ فاروق نے بھی احتیاط کرتے ہوئے ڈبیا کو رومال میں باندھ لیا اور رومال کا ایک سرا چٹکی میں پکڑ کر اسے لٹکا دیا۔ اگرچہ بچھو ڈبیا سے اب باہر نہیں نکل سکتے تھے، پھر بھی اسے ڈر لگ رہا تھا۔

دوسرا کمرہ نواز خاطر کا تھا۔ یہاں بھی ایک سوٹ کیس کے سوا کچھ نہیں تھا — انھوں نے تھوڑی سی کوشش کے بعد سوٹ کیس کو کھول لیا، لیکن اس میں انھیں سوائے کپڑوں کے اور کچھ نہ ملا — ہاں، چند خطوط ضرور تھے — لفافوں پر نواز خاطر کا نام لکھا تھا — محمود نے کچھ سوچ کر ان لفافوں کو بھی اپنی جیب میں ٹھونس لیا اور سوٹ کیس بند کرنے کے بعد دروازہ بند کرتے ہی آفاق شیرازی کے کمرے میں داخل ہوئے۔

آفاق شیرازی کے کمرے میں انھیں سوٹ کیس کو کھولنے کی بھی ضرورت پیش نہیں آئی۔ وہ پہلے ہی کھلا پڑا تھا، اس

سوٹ کیس کی ایک جیب میں انہیں ویسا ہی ایک ٹکڑا ملا ۔۔ وہ چونک اٹھے ۔۔ حیرت بھری نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ بھی ایک چوتھا حصہ ہے! گویا ان کے پاس ایک نقشے کے دو حصے جمع ہو گئے تھے، دو باقی تھے۔ وہ بے تابی کے عالم میں عابدہ سلطانہ کے کمرے میں داخل ہوئے اور پھر انہیں ایک زور دار جھٹکا لگا۔

عابدہ سلطانہ، نواز خاطر اور آفاق شیرازی کمرے کے درمیان میں کرسیوں پر اس طرح بیٹھے تھے کہ ان کے چہرے دروازے کی طرف تھے۔ وہ دھک سے رہ گئے، کیونکہ ان کے والد تو کھنڈرات کی طرف ہی گئے تھے اور انہوں نے ان سے کہا تھا کہ اگر یہ لوگ واپس آنے لگے تو وہ ان کے واپس آنے سے پہلے ہی انہیں خبردار کر دیں گے، لیکن وہ خبردار نہیں کر سکے تھے اور اب ان تینوں کی گھورتی نظریں ان پر جمی تھیں۔

اسی وقت انہوں نے قدموں کی آواز سنی۔ وہ چونک کر مڑے۔ ان تینوں نے بھی نظریں آنے والوں کی طرف اٹھا دیں۔۔ انہوں نے دیکھا، انسپکٹر جمشید، فرزانہ اور نواب صاحب چلے آ رہے تھے۔

پھر چیخ

"نواب صاحب، یہ سب کیا ہے؟" نواز خاطر نے تقریباً چلا کر کہا۔

"آپ کا اشارا کس طرف ہے جناب؟" نواب صاحب بولے۔

"انسپکٹر جمشید کے لڑکے ہمارے کمروں کی تلاشی اور وہ بھی بغیر اجازت کیوں لیتے پھر رہے ہیں؟"

"یہ قتل کے ایک کیس کی تفتیش کے سلسلے میں کیا جا رہا ہے۔ اگر آپ لوگوں میں سے کوئی قاتل نہیں ہے تو آپ کو کیا فکر، اور اگر آپ میں سے کوئی ایک قاتل ہے تو باقیوں کو کیا فکر۔۔ ہاں، قاتل یہ اعتراض ضرور کرے گا کہ اس کے کمرے کی تلاشی کیوں لی گئی۔" نواب صاحب کی بجائے انسپکٹر جمشید نے جواب دیا۔۔ ان کی نظریں نواز خاطر کو گھور رہی تھیں۔

"میں قاتل نہیں ہوں۔" نواز خاطر نے گھبرا کر کہا۔

"میں نے یہ نہیں کہا۔۔ اب بتائیے، آپ میں سے تلاشی

دینے پر کسے اعتراض ہے۔"

"ہم میں سے کسی کو کوئی اعتراض نہیں۔" آفاق شیرازی بولا۔

"چلو بھئی، ان کا کمرہ بھی دیکھ ڈالو۔ ہماری موجودگی میں عابدہ سلطانہ کے کمرے کی بھی تلاشی لے لو۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

عابدہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ پرسکون انداز میں کھڑی رہی۔

انہوں نے سب کے سامنے عابدہ کا سوٹ کیس کھولا اور اس کی تلاشی شروع کر دی، لیکن کوئی کام کی چیز نہ ملی۔ یہ دیکھ کر انسپکٹر جمشید، محمود اور فاروق کو کمرے کے کونے میں لے گئے اور دبی آواز میں بولے:

"ابھی تک کچھ ملا بھی ہے یا ٹامک ٹوئیاں ہی مارتے پھر رہے ہو۔"

"کیوں نہیں ابا جان، جان عالم مقتول کے سوٹ کیس سے زندہ بچھوؤں کی ایک ڈبیا ملی ہے ۔۔۔ اتفاق سے ہم نے اسے کھول کر بھی دیکھ لیا تھا۔ ہم بال بال بچے ۔۔۔ آپ تو جانتے ہی ہیں ابا جان، ہم بال بال بچنے میں بہت ماہر ہیں۔" فاروق جلدی جلدی کہتا چلا گیا۔

"ہاں، جانتا ہوں، اور کچھ۔" انہوں نے منہ بنایا۔

"اس کے سوٹ کیس کی ایک جیب سے کسی نقشے کا چوتھا حصہ ملا ہے۔ ایسا ہی ایک ٹکڑا آفاق شیرازی کے سوٹ کیس سے ملا

ہے، لیکن نواز خاطر اور عابدہ سلطانہ کے سوٹ کیس سے تیسرا اور چوتھا ٹکڑا نہیں ملا۔"

"ہوں، تو یہ لوگ واقعی کسی خزانے کی تلاش میں ہیں۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے، پھر وہ سب کی طرف مڑے اور بولے:

"کیا آپ لوگ کسی خزانے کی تلاش میں یہاں آئے ہیں؟"

ان کے جملے کا اثر حیرت انگیز ہوا۔ نواز خاطر، آفاق شیرازی اور عابدہ سلطانہ زور سے چونکے ۔۔۔ ان کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں ۔۔۔ پھر عابدہ سلطانہ نے بھنا کر کہا۔

"آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں ۔۔۔ ہم تو صرف کھنڈرات کی تحقیقات کے لیے آئے ہیں۔"

"تب پھر جان عالم اور آفاق شیرازی کے سوٹ کیسوں سے ایک نقشے کے دو ٹکڑے کیوں ملے ہیں۔"

"کیا نقشے کے دو ٹکڑے ملے ہیں۔" نواز خاطر نے غراتی ہوئی آواز میں کہا۔ پھر وہ آفاق شیرازی کی طرف مڑا:

"تو تم اب تک اس پاگل پن میں مبتلا ہو اور جان عالم بھی مرتے دم تک اسی چکر میں رہا ہے۔"

"پاگل پن، کیا مطلب؟" انسپکٹر جمشید حیران ہو کر بولے۔

"ان کھنڈرات کی طرف روانہ ہونے سے پہلے انہیں کہیں سے ایک نقشے کے دو ٹکڑے مل گئے تھے۔ انہوں نے سوچا،

لگے ہاتھوں وہ کھنڈرات میں خزانہ بھی تلاش کر لیں گے۔"

"لیکن انہیں یہ کس طرح معلوم ہوا کہ ان ٹکڑوں کا تعلق اس علاقے کے کھنڈرات سے ہے' اور دوسرے یہ کہ چار ٹکڑوں میں سے صرف دو کی مدد سے یہ کس طرح خزانے کے اصل مقام تک پہنچ سکتے ہیں۔"

"آپ نے ان ٹکڑوں کو شاید ابھی تک دیکھا ہی نہیں۔ یا غور سے نہیں دیکھا۔ اس کے ایک کونے میں ق۔ ر۔ م لکھا ہے۔ جان عالم اور آفاق شیرازی نے ان حرفوں سے بننے والے نام کے سلسلے میں بڑے پاپڑ بیلے۔ ق۔ ر۔ م سے پہلے کھنڈرات کا لفظ بھی لکھا ہے۔ انہوں نے ان تمام جگہوں کے نام جمع کیے، جہاں جہاں ملک میں مشہور کھنڈرات پائے جاتے ہیں؛ چنانچہ جب ان کے سامنے قصبہ رومان چند کا نام آیا تو اچھل پڑے۔ انہیں یقین ہوگیا کہ نقشے کے ان دو ٹکڑوں کا تعلق اس علاقے کے انہی کھنڈرات سے ہے، جن کی تحقیقات کے لیے ہم روانہ ہونے والے ہیں اور اسی وقت انہوں نے پروگرام بنا لیا کہ تحقیقات کے ساتھ ساتھ یہ خزانہ بھی تلاش کرنے کی کوشش کریں گے، لیکن آنے کے بعد انہیں کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔"

یہاں تک کہہ کر نواز خاطر خاموش ہوگیا۔

"لیکن ہم تو کھنڈرات میں ایک سرنگ نکلی ہوئی دیکھ کر آ

رہے ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"وہ سرنگ تو کھنڈرات کی تحقیقات کے سلسلے میں ملی ہے۔ اس کا خزانے سے کوئی تعلق نہیں۔" نواز خاطر نے جواب دیا۔ اس کے چہرے پر ذرا بھی گھبراہٹ یا پریشانی کے آثار نظر نہیں آ سکے تھے۔ جب کہ انسپکٹر جمشید کا خیال یہ تھا کہ وہ تو تینوں ان کا یہ سوال سن کر بوکھلا جائیں گے۔

"تو ان دونوں کو اس سلسلے میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی نہیں۔"

"جان عالم کی موت کے بارے میں آپ لوگ کیا کہتے ہیں؟"

"اس کی موت انتہائی پراسرار حالات میں ہوئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں، لیکن اس کی موت سے ہمارا ہرگز کوئی تعلق نہیں۔" آفاق شیرازی بولا۔

"اگر آپ کا تعلق نہیں تو پھر کس کا ہوگا۔ بھلا یہاں کے کسی آدمی کو جان عالم سے کیا دشمنی ہو سکتی تھی۔"

"آپ بھول رہے ہیں، اس حویلی میں بھوت پریت رہتے ہیں۔ یہ کام ان کا بھی ہو سکتا ہے۔ جب کہ خنجر پر نشانات سے ثابت ہے۔"

"لیکن آپ لوگوں کے آنے سے پہلے تو حویلی میں کبھی ایسی

آوازیں سنائی نہیں دیں۔"

"ہو سکتا ہے، ہمیں جو کمرے دیے گئے ہیں، ان میں سے ایک یا دو میں بھوت پریت رہتے ہوں اور انہیں ہمارے آنے کی وجہ سے تکلیف پہنچی ہو۔"

"میں ایسی باتیں سوچنا بھی پسند نہیں کرتا۔ اس سُرنگ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"ہم نے سوچا ہے، اس میں داخل ہو کر دیکھیں گے، لیکن اس کے اندر داخل ہونا بھی موت کو دعوت دینے کے برابر ہے، وہ نہ جانے کس زمانے سے بند پڑی تھی — اب ہمیں آکسیجن کے سلنڈروں کا بندوبست کرنا ہوگا۔ ان کے بغیر تو اندر داخل ہونا بے وقوفی ہوگی — قصبہ رومان چند میں سلنڈر ملیں گے نہیں، لہٰذا اگر آپ ہم میں سے ایک کو شہر تک جانے کی اجازت دے دیں تو وہ جا کر سلنڈر لے آئے گا۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں — باقی دو تو یہاں موجود ہی رہیں گے نا۔" وہ بولے: "اگر وہ نہ لوٹا تو باقی دونوں کو گرفتار کر لیا جائے گا۔"

"ضرور ضرور —" نواز خان نے کہا۔

یہ کہہ کر وہ واپس پلٹ پڑے اور اپنے کمرے میں آ گئے۔

"ہاں بھئی، اب دکھاؤ — بچھوؤں کی ڈبیا اور نقشے کے

ٹکڑے —"

"جی بہتر —" محمود نے کہا — اور انہوں نے دونوں چیزیں نکال کر ان کے سامنے رکھ دیں۔

پہلے انہوں نے نقشے کے ٹکڑوں کو بغور دیکھا، پھر ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر دیکھا، یہ آمنے سامنے کے ٹکڑے ثابت ہوئے۔ درمیانی ٹکڑے موجود نہیں تھے۔

"حیرت ہے، اس پر بھی بچھو بنا ہے اور وہ بھی سنہری رنگ کا — یہ لوگ بھی اپنے ساتھ بچھو لے کر آئے ہیں۔ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"معاملہ پُراسرار لگتا ہے۔" فرزانہ بولی۔

"وہ تو صاف ظاہر ہے، تم نے کون سی نئی بات کہہ دی،" فاروق جل کر بولا۔

"تو چلو، نئی بات تم کہہ ڈالو۔" فرزانہ نے بھنا کر کہا۔

"کیوں نہ اس سرنگ میں ہم داخل ہو کر دیکھیں۔" فاروق بولا۔

"فاروق، یہ تم کہہ رہے ہو۔"

"نہیں تو، تمہارے کانوں کو دھوکا ہوا ہوگا، بلکہ تمہارے کان بجے ہوں گے۔ میں بے چارہ ایسی بات کہنا کیا جانوں۔ ایسی باتوں کے لیے تو بس لے دے کے تم دونوں ہی رہ گئے ہو۔"

فاروق نے جلے کٹے انداز میں کہا۔

"اب اتنے انگارے بھی نہ چباؤ کہ منہ ہی جھلس جائے۔ سرنگ میں داخل ہونے کے لیے تو آثارِ قدیمہ کے طالب علموں کو بھی گیس ماسک اور آکسیجن کے سلنڈروں کی ضرورت ہے، ہم تو ہیں کس باغ کی مولیاں۔" محمود نے مسکرا کر کہا۔

"خدا نخواستہ ہم کیوں ہونے لگے مولیاں۔" فاروق جلدی سے بولا۔

"بھئی، اب کام کی بات کرلو! فی الحال ہم سرنگ میں داخل نہیں ہوں گے۔ اس کے لیے تو ہم کچھ ماہرین کی خدمات بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ ہمیں تو سب سے پہلے یہ معلوم کرنا ہے کہ جان عالم کا قاتل کون ہے۔ خزانے وغیرہ کی میری نظر میں کوئی اہمیت نہیں ہے اور اگر ایک انسانی جان صرف ایک خزانے کے لیے گئی ہے، تو یہ اور بھی بری بات ہے۔"

"جہان خان نے قصبہ رومان چند کی تاریخ پر وہ پرانی کتاب بھی نہیں بھیجی۔" فرزانہ کو اچانک یاد آیا۔ عین اسی وقت رحیم نے آکر بتایا:

"جہان خان آگئے ہیں اور آپ کے لیے ایک کتاب لائے ہیں۔"

وہ فوراً اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور نواب صاحب کے کمرے میں پہنچے۔ جہان خان نے ان کی طرف دیکھتے ہی کہا:

"لیجیے جناب، یہ رہی وہ کتاب، لیکن اس کتاب سے آپ کو قتل کے اس کیس میں کوئی مدد نہیں ملے گی۔"

"وہ کیوں؟"

"میں اسے پڑھ کر دیکھ چکا ہوں۔ اس میں ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے۔"

"خیر، میں اسے پھر بھی پڑھ کر دیکھوں گا۔" وہ مسکرائے اور کتاب اس کے ہاتھ سے لے لی۔

یہ ایک حد درجے پرانی کتاب تھی۔ اس کا رنگ بھی بالکل زرد پڑ گیا تھا۔ کتاب پر کپڑے کی جلد تھی — اوراق بھر بھرے ہو چکے تھے اور اکثر پھٹے ہوئے تھے۔ انہوں نے اس پر ایک نظر ڈالی اور جہان خان سے بولے:

"نواب صاحب کے باقی تین مہمانوں میں سے ایک شہر تک جانا چاہتا ہے۔ وہ شہر سے گیس ماسک اور آکسیجن کے سلنڈر لانا چاہتا ہے۔ میں نے اس شرط پر اجازت دے دی ہے کہ اگر شہر جانے والا واپس نہ لوٹا تو باقی دونوں کو گرفتار کر لیا جائے گا۔ آپ اس کے پیچھے اپنا ایک آدمی لگا دیں جو پوری احتیاط سے اس کا تعاقب کرے۔ میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ شہر میں گیس ماسک وغیرہ خریدنے کے علاوہ تو کچھ اور نہیں کرتا۔"

"بہت اچھا، میں اپنے ایک بہت ہی ہوشیار ماتحت کی

ڈیوٹی لگا دیتا ہوں۔" اس نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیوں بھئی جمشید، معاملہ ابھی تک پلے پڑا یا نہیں؟"

"ہم کافی آگے بڑھ چکے ہیں۔ اور انشاءاللہ معاملے کی تہہ تک پہنچ جائیں گے۔ آپ فکر نہ کریں، فی الحال میں کچھ بھی نہیں بتا سکتا۔"

"میری پریشانی بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ قصبے کے لوگ طرح طرح کی باتیں بنا رہے ہیں۔"

"آپ پروا نہ کریں، لوگوں کا تو کام ہی باتیں بنانا ہے۔"

"وہ یہاں تک کہہ رہے ہیں کہ نواب صاحب نے خود ہی اپنے ایک مہمان کو قتل کر دیا ہے۔"

"آپ نے ــــ لیکن بھلا آپ کے پاس ایسا کرنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔" انسپکٹر جمشید چونکے، کیونکہ اس کیس میں وہ غیر ارادی طور پر اپنے اصول سے ہٹ گئے تھے۔ انہوں نے نواب صاحب اور ان کے گھر کے لوگوں پر ذرا دیر کے لیے بھی شک نہیں کیا تھا۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ لوگوں کے تو جو منہ میں آتا ہے، کہہ دیتے ہیں۔"

"ہوں، خیر آپ فکر نہ کریں۔ اس کیس کے حل ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔"

اس کے بعد وہ اپنے کمرے میں آ گئے۔ انسپکٹر جمشید کتاب میں

گم ہو گئے اور اس حد تک گم ہو گئے کہ جب تک ختم نہ کر لی، سر اوپر نہ اٹھایا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے آپ کوئی انتہائی دلچسپ جاسوسی ناول پڑھ رہے تھے۔ سننے میں آ رہا ہے کہ ان دنوں ایسے جاسوسی ناول لکھے جا رہے ہیں کہ انہیں ختم کیے بغیر کتاب رکھی نہیں جاتی۔" فاروق نے شوخ لہجے میں کہا۔

"نہیں بھئی، یہ کتاب اس قدر دل چسپ ہرگز نہیں ہے۔ میں تو ضرورت کے تحت اسے بغور پڑھ رہا تھا، لو تم تینوں بھی اسے پڑھ لو۔" انہوں نے کہا۔

"لیکن ابا جان، اگر یہ کتاب دل چسپ نہیں ہے تو ہمارے پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ ہمیں مختصر کر کے بتا دیں کہ اس میں کیا ہے اور اس کی کس بات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔"

"چلو یوں ہی سہی ــــ اس طرح وقت بھی ضائع ہونے سے بچ جائے گا۔ قصبہ رومان چند آج سے دو ہزار سال پہلے ایک ہندو راجہ رومان چند نے بسایا تھا۔ یہ حویلی جس میں اس وقت تم بیٹھے ہو، اس کے وزیر کی تھی اور وہ کھنڈرات جن سے ابھی ابھی میں اور فرزانہ ہو کر آئے ہیں، اس بادشاہ کے محلات تھے۔ رومان چند سونا، چاندی اور دولت جمع کرنے کا بہت شوقین تھا۔ اس سلسلے میں وہ لوگوں پر بہت ظلم کرتا تھا۔ اس کے سپاہی لوگوں سے

زبردستی دولت حاصل کیا کرتے تھے اور وہ اس دولت سے سونا خرید خرید کر جمع کرتا جاتا تھا۔ آخر اس کی رعایا تنگ آ گئی۔ عوام نے مل کر اس کے محل پر ہلّہ بول دیا۔ اس کے سپاہی بھاگ کھڑے ہوئے۔ لوگوں نے بادشاہ کے محل کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ بادشاہ کے خاص آدمیوں نے محل کے دروازے اندر سے بند کر لیے۔ عوام دروازوں پر ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے محل کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ بادشاہ کے خاص آدمیوں کو بھی چن چن کر قتل کر دیا گیا۔ آخر بادشاہ گرفتار ہوا اور عوام کی عدالت کے سامنے آیا۔ اس سے پوچھا گیا کہ وہ سونا اور چاندی کا ذخیرہ کہاں ہے، جو اس نے عوام کے خون پسینے کی کمائی کا لوٹا ہے۔ لیکن رومان چند نے انہیں کچھ نہ بتایا۔ اس نے صرف اتنا کہا، وہ خزانہ میرے دوسرے جنم میں کام آئے گا۔ میں مرنے کے بعد ایک بار پھر زندہ ہوں گا اور اس وقت اس خزانے کو نکالوں گا اور پھر سے اپنی ریاست بناؤں گا۔ میرے چند بہت ہی خاص معماروں نے اس خزانے کو محل کے نیچے ایک خفیہ جگہ چھپا دیا ہے اور اس کا راز سوائے میرے اور وزیر کے اور کسی کو معلوم نہیں۔ وزیر کسی نہ کسی طرح پہلے ہی یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا ہے؛ ورنہ میں اسے اپنے ہاتھ سے قتل کر دیتا۔ میں نے ان معماروں کو بھی قتل کر دیا ہے۔ جنہوں نے خزانے کے لیے خفیہ جگہ بنائی ہے۔ وزیر کی باری آئی،

لیکن وہ پہلے ہی بھانپ گیا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے؛ چنانچہ وہ اپنے بیوی بچوں کو لے کر فرار ہو گیا۔ میرے خاص دستے نے اسے چاروں طرف تلاش کیا، لیکن اس کا کوئی سراغ نہ لگ سکا؛ گویا اب اس دنیا میں میرے اور میرے وزیر کے سوا کسی کو خزانے کی جگہ کا علم نہیں۔ میں اس راز کو سینے میں چھپائے مر جاؤں گا۔ بھگوان کرے، میرا وزیر بھی اسی حالت میں مر جائے اور کسی کو خزانے کے بارے میں نہ بتائے۔ عوام نے راجہ کی زبان کھلوانے کے لیے بہت زور لگایا۔ ہر حربہ استعمال کر ڈالا، لیکن اس نے کچھ نہ بتایا اور زخموں کی تاب نہ لا کر مر گیا۔ لوگوں نے وزیر کی تلاش میں گھوڑے دوڑائے، لیکن وہ تو اس بغاوت سے بہت پہلے فرار ہو چکا تھا، اس کا کوئی پتا نہ چل سکا۔ لوگوں نے محلات کی بنیادیں کھود ڈالیں۔ تمام عمارت نیست و نابود ہو گئی اور کھنڈر کی صورت اختیار کر گئی، لیکن انہیں خزانہ نہ مل سکا۔ آخر وقت کے ساتھ ساتھ لوگ اس خزانے کو بھول گئے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ خزانہ آج بھی ان کھنڈرات کے نیچے ہی کہیں موجود ہے اور وزیر کا گھرانا اسے حاصل کرنے کی فکر میں آج تک ہو گا، جب کہ اس واقعے کو دو ہزار سال گزر چکے ہیں، لیکن یہ ناممکن نہیں؛ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ مختلف اوقات میں مختلف افراد نے اس خزانے کی تلاش میں سر کھپایا ہو، لیکن کامیاب نہ ہوتے ہوں، اور ناں،

بادشاہ نے مرتے وقت یہ بھی کہا تھا کہ اس کی روح اس خزانے کی حفاظت کے لیے ہمیشہ اس کھنڈرات کے گرد منڈلاتی رہے گی۔"
یہاں تک کہہ کر انسپکٹر جمشید خاموش ہو گئے۔

"اف خدا، یہ تو بڑی خونی کہانی ہے۔" فرزانہ کپکپا اٹھی۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے یہ چاروں وزیر کے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔" محمود بڑبڑایا۔

"اب تم انہیں چاروں نہیں، تینوں کہہ کر مخاطب کرو۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"چلو یوں ہی سہی، لیکن ہم پروفیسر ابرام کو کس خانے میں فٹ کریں گے۔ کیا وہ یہاں صرف ان کھنڈرات کی تحقیقات کے لیے آیا تھا۔ یا وہ بھی خزانے کی تلاش میں یہاں آیا تھا۔

اگر وہ خزانے کی تلاش میں آیا تھا تو اب اس نے خزانے کے نقشے کے ٹکڑے ان چاروں کو دے کر یہاں کیوں بھیج دیا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔" محمود جلدی جلدی کہتا چلا گیا۔

"ہو سکتا ہے، وہ صرف ماہر آثارِ قدیمہ ہو اور ان کھنڈرات کے ہی چکر میں آیا ہو۔ خزانے سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو اور ان چاروں کو نقشے کے وہ ٹکڑے کہیں سے مل گئے ہوں؛ چنانچہ پہلے

انہوں نے آثارِ قدیمہ کا علم حاصل کرنے کا پروگرام بنایا اور پھر کچھ علم حاصل کرنے کے بعد یہاں آ گئے۔" فرزانہ نے خیال ظاہر کیا۔

"ہاں، سبھی کچھ ممکن ہے۔ ہمیں تحقیقات کرنا ہو گی۔" انسپکٹر جمشید بولے: "سونے سے پہلے تک اس معاملے پر غور کرو۔ آج رات بھی اگر وہ آوازیں سنائی دیں تو ہم باہر نکل کر اچھی طرح چھان بین کریں گے۔ ان آوازوں کا راز بھی معلوم کرنا ہو گا۔"

رات کا کھانا کھانے اور کچھ دیر نواب صاحب کے ساتھ گزارنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آ گئے۔ معاملے پر غور کرتے کرتے نہ جانے کب ان کی آنکھ لگ گئی، اور پھر آنکھ کھلی تو دن نکل چکا تھا۔

"ارے، آج بھوت اپنا پروگرام نشر کرنا بھول گئے۔" فاروق کے منہ سے نکلا۔

"ہو سکتا ہے، ہم ہی اپنے کان کھولنا بھول گئے ہوں۔" فرزانہ نے منہ بنایا۔

"گھر کے دوسرے لوگوں سے تصدیق ہو سکتی ہے۔ جھگڑنے کی ضرورت نہیں۔" محمود نے کہا۔

وہ تیار ہو کر ناشتے کی میز پر پہنچے۔ ابھی تک نواب صاحب کے مہمان میز پر نہیں پہنچے تھے؛ البتہ نواب صاحب اور ان کے گھرانے کے لوگ موجود تھے۔ ملازم ناشتا لگا رہے تھے۔ اسی وقت

نواز خاطر اور عابدہ سلطانہ آتے نظر آئے ۔ آفاق شیرازی ان کے ساتھ نہیں تھا۔

"مسٹر آفاق نہیں آئے ؟"

"ہمارا تو خیال تھا کہ وہ آچکے ہوں گے ۔"

"کیوں، کیا آپ رات ایک کمرے میں نہیں سوئے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"جی نہیں، جان عالم کے قتل نے ہمیں ایک دوسرے سے خوف زدہ کر دیا ہے، لہذا ہم نے رات الگ الگ کمرے میں سونے کا پروگرام بنایا تھا۔ میں تیار ہو کر کمرے سے نکلا ہی تھا کہ عابدہ سلطانہ صاحبہ کو باہر نکلتے دیکھا؛ چنانچہ ہم دونوں ساتھ ہی چلے آئے ۔ میرا خیال ہے، آفاق صاحب بھی آتے ہی ہوں گے ۔" نواز خاطر نے جلدی جلدی کہا۔

"آپ لوگوں کی آپس میں رشتے داری تو نہیں ہے؟" فرزانہ نے اچانک کہا۔ اس کی نظریں ان دونوں کے چہروں پر جمی تھیں۔

"نہیں، ہم رشتے دار نہیں ہیں۔" نواز خاطر نے نفی میں سر ہلایا۔

"آپ نے یہ سوال کیوں پوچھا ؟" عابدہ نے پوچھا۔

"مجھے آپ چاروں کے چہرے ایک دوسرے سے ملتے جلتے نظر آتے ہیں۔"

"آپ کا وہم ہے ۔ ہم تو دور پار کے رشتے دار بھی نہیں ہیں۔"

عابدہ بولی ۔

"خیر، چھوڑیے ۔ ارے وہ مسٹر آفاق تو اب تک نہیں آئے۔ نواب صاحب، کہیں وہ ابھی تک سوئے نہ پڑے ہوں ۔ ہم ان کا انتظار نہ کرتے رہ جائیں ۔ میرے خیال میں آپ رحیم کو بھیج کر انہیں بلوا ہی لیں ۔"

"اچھی بات ہے ۔" نواب صاحب نے کہا اور رحیم سے بولے:

"جاؤ بھئی، ذرا آفاق شیرازی کو بلا لاؤ۔ اگر وہ ابھی تک سو رہے ہوں تو جگا دینا۔"

"جی بہتر ۔" اس نے کہا اور چلا گیا۔ ابھی دو منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ حویلی میں ایک لرزہ خیز چیخ گونج اٹھی ۔

بھوتوں کا کام

وہ سب اچھل پڑے — چہروں پر خوف دوڑ گیا، پھر نواب صاحب کے منہ سے نکلا:

"ارے، یہ رحیم کو کیا ہوا۔"

پھر وہ سب آفاق شیرازی کے کمرے کی طرف دوڑ پڑے — انہوں نے دیکھا، رحیم ایک کھلی کھڑکی کے نیچے برآمدے میں بیہوش پڑا تھا — کمرے کا دروازہ بند تھا۔ انسپکٹر جمشید اور ان کے پیچھے آنے والوں نے کھڑکی میں سے کمرے کے اندر دیکھا — دوسرے ہی لمحے ان کی آنکھیں خوف اور حیرت سے پھیل گئیں۔

بستر پر آفاق شیرازی بالکل سیدھا لیٹا تھا۔ اس کے سینے میں ایک خنجر دل کے مقام پر پیوست تھا اور وہ نہ جانے کب کا مر چکا تھا — کریم تو رحیم کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ محمود کمرے کی کھڑکی پھلانگ کر اندر پہنچا اور دروازہ کھول دیا۔ انسپکٹر جمشید نے باقی لوگوں کو باہر ہی کھڑے رہنے کا اشارا کیا۔ خود

فاروق اور فرزانہ کے ساتھ اندر داخل ہوئے — سب سے پہلے تو انہوں نے لاش کو چھو کر دیکھا — جسم بالکل سرد اور اکڑا ہوا تھا، جس کا مطلب یہ تھا کہ رات میں کسی وقت ختم ہو چکا تھا۔

اسی وقت جہان خان کو فون کیا گیا اور ایک بار پھر کل والی کارروائی شروع ہو گئی — خنجر پر سے انگلیوں کے نشانات اٹھوائے گئے — آفاق کے کمرے سے انہیں کوئی اور چیز نہ ملی؛ البتہ نواز خاطر اور عابدہ کے قدموں کے نشانات ضرور موجود تھے، لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی — یہ لوگ آخر ایک دوسرے کے کمرے میں آتے جاتے بھی تھے۔

"آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"جی کیا مطلب، آپ کو کس چیز کا ڈر تھا؟"

"اس چیز کا کہ ان میں سے کوئی اور قتل نہ ہو جائے، اور مزے کی بات یہ کہ خنجر بھی بالکل پہلے جیسا ہے — یعنی قاتل نے نواب صاحب کی الماری سے دوسرا خنجر نکال کر یہ کام کیا ہے۔"

"ہم سے غلطی یہ ہوئی کہ خنجروں والی الماری کو تالا نہیں لگایا۔" محمود بولا۔

"ہاں واقعی، لیکن میرا خیال ہے کہ تالا لگانے کے بعد بھی یہ واردات رک نہیں سکتی تھی۔" فرزانہ سوچ میں گم لہجے میں بولی۔

"ہاں، اس میں کوئی شک نہیں — قاتل کا یہ پروگرام پہلے

ہی بن چکا تھا۔ لیکن ....." پرسکون انداز میں کہتے کہتے انسپکٹر جمشید
نے چونک کر کہا۔

"لیکن کیا ابا جان؟" فرزانہ نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولے۔

"کیا کیسے ہو سکتا ہے؟"

"سوچو کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔" انسپکٹر جمشید نے عجیب بات
کہی۔

"جی کیا مطلب؟ ہم یہ سوچیں کہ آپ کیا سوچ رہے ہیں؟
بھلا ہم یہ بات کس طرح سوچ سکتے ہیں؟" فاروق نے بوکھلا کر کہا۔

"اپنی عقلوں پر زور دے کر۔" وہ بولے، لیکن مسکراہٹ
کا ان کے چہرے پر دُور دُور تک پتا نہ تھا۔

"خیر تو ہے ابا جان، آپ یکایک بہت سنجیدہ ہو گئے۔"

"ہاں، کیونکہ میں سوچ رہا ہوں کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے اور تم
بھی سوچو۔"

"جی بہتر، اگر آپ کا حکم یہی ہے تو سوچنا شروع کر دیتے
ہیں۔ سمجھ میں کچھ آئے نہ آئے، اس کی ذمّے داری ہم پر نہیں
ہو گی۔ فاروق بولا۔

"ذمے داری ذمے دار لوگ اٹھایا کرتے ہیں۔" فرزانہ نے موقع
گنوانا مناسب نہ سمجھا۔

"میرا خیال ہے ابا جان، آپ بالکل ٹھیک سوچ رہے ہیں کہ
یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" اچانک محمود نے فاروق اور فرزانہ کو
حیران کر دیا۔

"ہائیں ہائیں، یہ کیا۔ فرزانہ، یہ تو ہم سے دو قدم آگے
نکلنے لگا ہے! گویا پر پرزے نکالنے کے چکر میں ہیں۔" فاروق
نے بوکھلا کر کہا۔

"ہاں، کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ اب میں کیا کروں۔ شاید
آج میری عقل میرا ساتھ چھوڑ چکی ہے۔" فرزانہ نے افسوس زدہ لہجے
میں کہا۔

"ایک دن تو یہ ہونا ہی تھا۔ آخر تمہاری عقل کب تک تمہارا
ساتھ دے سکتی تھی۔ ایک نہ ایک دن تو یہ ساتھ چھوٹنا ہی تھا۔
مجھے بہت افسوس ہے فرزانہ۔ خدا تمہیں صبر دے۔" فاروق غمگین
آواز میں کہتا چلا گیا۔

"توبہ ہے تم سے، بات کو کہیں کا کہیں لے جاتے ہو۔"
محمود جھلا اٹھا۔

"ان باتوں کی یہی تو مصیبت ہے۔ آخر یہ کہیں کی کہیں نکل ہی
کیوں جاتی ہیں۔ تم انہیں تو کچھ نہیں کہتے۔ ایک میں ہی مل
گیا ہوں ڈانٹنے کے لیے۔" فاروق بھلا کہاں رکنے والا تھا۔

"دھت تیرے کی۔" محمود نے جھلا کر ران پر ہاتھ مارا۔

"چلو محمود، بتاؤ۔ یہ تو بس وقت ضائع کر سکتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے تنگ آ کر کہا۔

"ابا جان، آپ نے یہی سوچا ہے ناکہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" محمود مسکرایا۔

"ہاں بھئی، میں نے جب سے آفاق شیرازی کی لاش دیکھی ہے، یہی سوچ رہا ہوں۔" انہوں نے بھی مسکرا کر کہا۔

"تب پھر میں بھی آپ کے والی بات کہتا ہوں اور وہ یہ کہ، واقعی یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ جان عالم کے قتل کے بعد باقی کے تین مہمانوں میں سے کسی ایک کو قاتل خیال گیا تھا۔ اب چونکہ تین میں سے ایک قاتل تھا اور تینوں بے گناہ ہونے کے دعوے دار تھے۔ اس لیے ان میں سے قاتل کو نہ پہچان سکے، لیکن اب جب کہ ان میں سے ایک اور یعنی آفاق شیرازی ختم کر دیا گیا ہے، تو معاملہ بالکل صاف ہے۔ نواز خاطر اور عابدہ سلطانہ میں سے ایک ہے، لہذا یہ بات کسی صورت بھی چھپی نہیں رہ سکتی۔ اب ان دونوں کو یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ قاتل دراصل کون ہے، لہذا وہ خوف زدہ ہوگا۔ یہ خوف اس پر بری طرح سوار ہو چکا ہوگا کہ اس کا دوسرا ساتھی دو آدمیوں کو پہلے ہی موت کے گھاٹ اتار چکا ہے، اب وہ اسے بھی نہیں چھوڑے گا، لہذا میں سمجھتا ہوں کہ قاتل نے آفاق شیرازی کو

قتل کر کے بڑی زبردست غلطی کی ہے۔ اب اس کی شخصیت بالکل بے نقاب ہو جائے گی۔ آؤ ہمیں پہلی فرصت میں ان دونوں سے ملاقات کرنی چاہیے۔" وہ جذبات سے لبریز آواز میں کہتا چلا گیا۔

انسپکٹر جمشید فوراً ہی اٹھ کھڑے ہوئے، تینوں نے ان کا ساتھ دیا۔ کریم سے معلوم ہوا کہ وہ دونوں اس وقت ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔ رحیم کے بارے میں اس نے بتایا کہ وہ ہوش میں آ چکا ہے۔

وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ انہوں نے دیکھا، نواز خاطر اور عابدہ سر جھکائے بیٹھے تھے۔ یوں لگتا تھا، جیسے کسی گہری سوچ میں گم ہوں۔ قدموں کی چاپ سن کر انہوں نے سر اٹھائے اور انہیں آتے دیکھ کر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

"مجھے آپ دونوں کو ایک جگہ دیکھ کر حیرت ہوئی، میرا تو خیال تھا کہ آپ الگ الگ کمرے میں بند ہو کر بیٹھے ہوں گے۔" انسپکٹر جمشید اندر داخل ہوتے ہوئے بولے۔

"کیوں جناب، اس کی کیا ضرورت ہے؟" نواز خاطر نے حیران ہو کر کہا۔

"اب اس میں تو کوئی شک نہیں رہا کہ قاتل آپ دونوں میں سے ایک ہے۔ کون ہے، یہ آپ کو اچھی طرح معلوم ہو چکا

ہے۔ ان حالات میں دوسرے کو لازمی طور پر قاتل سے خوفزدہ
ہونا چاہیے۔ کوئی شخص بھی قاتل کے ساتھ اتنے آرام سے کمرے
میں نہیں بیٹھ سکتا، جب کہ اسے بھی اپنی جان کا خطرہ ہو، لیکن
میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ دونوں یہاں ایک ساتھ بیٹھے ہیں، لہذا
اگر مجھے اس بات پر حیرت ہوئی ہے تو یہ کوئی عجیب بات
نہیں ہے۔"

"ہوں، بات تو آپ کی ٹھیک ہے، لیکن اصل بات یہ ہے کہ
قاتل ہم دونوں میں سے کوئی نہیں ہے۔" عابدہ سلطانہ بولی۔

"یہ کیسے ہوسکتا ہے اور اگر کسی طرح یہ ممکن ہے تو پھر
قاتل کون ہے؟"

"وہ بھوت جو رات کے وقت برآمدوں میں ادھم مچاتا ہے۔"
نواز خاطر بولا۔

"رات تو وہ خاموش رہا۔ شاید اسے نیند آگئی ہوگی۔" فاروق
نے بُرا سا منہ بنایا۔

"ہم نہیں جانتے، رات اس کی آوازیں کیوں سنائی نہیں دیں۔"
عابدہ نے بُرا سا منہ بنایا۔

"اچھا خیر، میں آپ دونوں کو خبردار کیے دیتا ہوں کہ آپ میں
سے کسی ایک کی بھی لاش ملے گی۔"

"آپ تو ہمیں ڈرائے دے رہے ہیں جب کہ ہم

دونوں میں سے کوئی بھی قاتل نہیں ہے۔" عابدہ سلطانہ نے جھلا کر
کہا۔

"آپ یہ بات اتنے یقین سے کس طرح کہہ سکتی ہیں۔ آپ
کو کیا خبر، آپ کے ساتھی نے جان عالم اور آفاق شیرازی کو قتل
کیا ہے یا نہیں۔"

"میں مسٹر نواز خاطر کو ایک مدت سے جانتی ہوں۔ یہ قاتل
نہیں ہوسکتے اور یہ بھی سُن لیجیے کہ جلد از جلد اپنی تحقیقات مکمل
کر لیجیے، کیونکہ ہم یہاں اپنا کام ختم کر چکے ہیں اور واپس جانا
چاہتے ہیں۔ یوں بھی ہمارے دو ساتھی موت کے گھاٹ اتر چکے
ہیں۔ ان کی جدائی ہم سے برداشت نہیں ہو رہی۔" عابدہ سلطانہ
نے جذباتی آواز میں کہا۔

"میں انشاءاللہ ایک آدھ دن تک آپ لوگوں کو فارغ کر
دوں گا، بشرطیکہ آپ میں سے کوئی قاتل نہ ہوا۔"

"بے فکر رہیں، ہم میں سے کوئی قاتل نہیں ہے۔" نواز خاطر
نے کہا۔

"آپ کی مرضی، میں آپ دونوں کے لیے ہی فکرمند ہوں، لیکن
آپ ایک دوسرے سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کر رہے۔ یہ بات
مجھے فکرمند تو کر ہی رہی ہے، حیرت میں بھی مبتلا کر رہی ہے۔
کیا آپ اپنے دونوں ساتھیوں کی لاشوں کو بھی ساتھ لے جانا

پسند کریں گے؟"

"جی ہاں" انہوں نے ایک ساتھ کہا۔

"بہت اچھا، ہم چلتے ہیں۔ جہان خان کو اپنے تحریری بیان دے دیجیے گا۔"

یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید اٹھ کھڑے ہوئے اور ان تینوں کے ساتھ باہر نکل آئے۔

"عجیب بات ہے۔ اگر یہ دونوں قاتل نہیں ہیں، تب بھی انہیں خوف زدہ ضرور ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے کوئی تو ہے جس نے جان عالم اور آفاق شیرازی کو ہلاک کیا ہے۔ کیا وہ انہیں ہلاک نہیں کر سکتا" محمود بولا۔

"ضرور کر سکتا ہے" فاروق نے سر ہلایا۔

"تب پھر یہ دونوں خوف زدہ کیوں نہیں ہیں" فرزانہ نے کہا۔

"اب ہم انہیں زبردستی تو خوف زدہ نہیں کر سکتے" فاروق بھنا گیا۔

"تو اس میں جھنجلانے کی کیا ضرورت ہے" محمود مسکرایا۔

"جھنجلاؤں نہ تو اور کیا کروں۔ اتنا کچھ معلوم ہونے کے بعد بھی ہم ابھی تک اندھیرے میں ہیں۔ آخر قاتل کون ہے۔ یہ کیس کس طرح حل ہوگا۔ ارے، ہم نے ابھی تک خنجروں والی الماری کو تو دیکھا ہی نہیں" اس نے بعد میں چونکتے ہوئے کہا۔

"دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ ظاہر ہے دوسرا خنجر اس میں سے غائب ہو چکا ہوگا" فرزانہ بولی۔

"کم از کم دیکھنا تو چاہیے اور اسے تالا بھی لگا دینا چاہیے، کیونکہ ابھی خطرہ موجود ہے" محمود نے جلدی سے کہا۔

"ٹھیک ہے، چلو" انسپکٹر جمشید بولے۔

وہ خنجروں والی الماری تک پہنچے۔ الماری کے پٹ کھول کر انہوں نے خنجروں والے خانے کو دیکھا اور پھر حیران رہ گئے۔ الماری میں سے دوسرا ہی نہیں، تیسرا اور چوتھا خنجر بھی غائب تھا۔ گویا اب الماری میں ایک خنجر بھی نہیں تھا۔

○

چند لمحوں تک وہ کبھی خنجروں والے خانے کو اور کبھی ایک دوسرے کو حیرت بھری نظروں سے دیکھتے رہے۔ آخر فرزانہ نے بوکھلائی ہوئی آواز میں کہا۔

"حیرت ہے، آدمی تو ایک قتل ہوا ہے اور خنجر اکٹھے تین غائب ہیں۔ اس بار قاتل کو خنجر چرانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"دوسرا خنجر وہ استعمال کر چکا ہے۔ اب اس کے پاس دو خنجر موجود ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ اسے دو خنجروں کی ایک کیا

ضرورت رہ گئی ہے — آدمی تو قتل ہونے کے لیے صرف ایک رہ
گیا ہے۔" محمود نے بھی حیرت بھرے انداز میں کہا۔

"یہ واقعی بہت عجیب بات ہے۔" فاروق نے کہا۔

"اور مجھے ان دونوں میں سے ایک بے وقوف پر غصہ آ رہا
ہے، جو قاتل نہ ہوتے ہوئے قاتل سے خوف زدہ نہیں ہے۔ آخر
وہ یہ کیوں نہیں سمجھتا کہ آفاق کے بعد اس کی باری بھی آسکتی
ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"کیا خبر، وہ بھی سمجھ رہا ہو کہ یہ ضرور کسی بھوت ووت کا
کام ہے۔" فرزانہ بولی۔

"اگر وہ ایسا خیال کر رہا ہے تو پھر وہ اور بھی بڑا بیوقوف
ہے۔ وہ یہ کیوں نہیں سوچتا کہ بھوت اسے بھی ختم کر سکتا ہے۔"
محمود نے کہا۔

"اسی لیے تو دونوں ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو رہے،
بھوت کے ڈر سے۔" فاروق مسکرایا۔

"دھت تیرے کی — اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ان دونوں میں
سے واقعی کوئی قاتل نہیں ہے۔" محمود نے جھلا کر کہا۔

"سوال یہ ہے کہ کیا یہ اس خزانے تک پہنچ چکے ہیں اور
یہ دو قتل صرف اس خزانے کے لیے ہوئے ہیں۔ آخر یہ انسان اتنا
بھوکا کیوں ہے — ظاہر ہے، راجہ دوبان چند کا خزانہ اتنا معمولی

تو ہوگا نہیں، پھر اگر یہ چاروں خاموشی سے اسے نکال لے جاتے
اور تقسیم کر لیتے تو کیا نقصان تھا — اب ان میں دو ختم ہو چکے
ہیں اور ایک اور کی زندگی بھی خطرے میں ہے — آخر چوتھا
آدمی اتنے بڑے خزانے کا کیا کرے گا — کیا قبر میں ساتھ لے
جائے گا۔" فرزانہ کہتی چلی گئی۔

"انسان، اور وہ بھی لالچی — انسان کا واقعی پیٹ کبھی
نہیں بھرتا — کتنی بھی دولت کے انبار اس کے سامنے لگا دیے
جائیں، وہ بھی اسے کم ہی نظر آئے گی۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"توبہ ہے، مجھے تو ایسی سوچ سے بھی گھن آتی ہے۔" فاروق
نے منہ بنایا۔

"ابا جان، کیوں نہ ہم چاروں کل ان کھنڈرات کا تفصیلی جائزہ
لیں۔ بلکہ جہان خان کے کچھ آدمیوں کو بھی ساتھ شامل کر لیں اور
کوشش کر کے اس سرنگ میں داخل ہو جائیں۔"

"ارے سرنگ، وہ تو رہ ہی گئی — ہم، میرا مطلب ہے، ان
لوگوں نے تو گیس ماسک اور آکسیجن کے سلنڈر منگائے تھے، جو شاید
آفاق شیرازی ہی لایا تھا — تو کیا اب انہوں نے سرنگ میں داخل ہونے
کا پروگرام ختم کر دیا ہے — کیونکہ ابھی تھوڑی دیر پہلے انہوں نے
بتایا ہے کہ وہ اپنا کام ختم کر چکے ہیں — جب کہ میرے خیال میں
ابھی انہوں نے سرنگ میں داخل ہو کر نہیں دیکھا، کیونکہ آج

ان کا گیس ماسک وغیرہ لے کر کھنڈرات کی طرف جانے کا پروگرام تھا، لیکن آفاق کی موت کی وجہ سے نہیں جا سکے۔ ان حالات میں تو انہیں اس پروگرام پر عمل کرنا چاہیے۔ آؤ ذرا ان سے ایک بار پھر بات کریں۔ میرا خیال ہے، ہمیں ان دونوں کو یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ الماری سے باقی تینوں خنجر غائب ہیں یعنی قاتل کے پاس اب دو خنجر اور موجود ہیں۔"

"اور کیا ہمیں ان خنجروں کو تلاش نہیں کرنا چاہیے۔" فاروق بول پڑا۔

"ضرور، یہ کام بھی کرنا ہو گا۔"

وہ ایک بار پھر ڈرائنگ روم میں آئے، لیکن نواز خاطر اور عابدہ سلطانہ کمرے میں دکھائی نہ دیے۔ اب انہوں نے ان کے کمروں کا رخ کیا۔ دونوں ایک ہی کمرے میں ملے۔

"معاف کیجیے گا۔ ہم آپ لوگوں کو پھر تکلیف دینے چلے آئے۔"

"کوئی بات نہیں جناب، تشریف لے آئیے۔ جہان خان ضروری کارروائی سے فارغ ہو کر واپس جا چکے ہیں۔ انہوں نے ہمارے تحریری بیانات کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی۔"

"اچھا۔" انسپکٹر جمشید کے لہجے میں حیرت تھی، پھر انہوں نے کہا: "آپ لوگوں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے بتایا تھا کہ آپ لوگ

اپنی تحقیقات مکمل کر چکے ہیں اور اب واپس جانا چاہتے ہیں۔ کیا یہ سچ ہے؟"

"جی ہاں، اس میں کوئی شک نہیں۔" عابدہ سلطانہ نے جلدی سے کہا۔

"تو کیا آپ لوگ اس سرنگ میں بھی داخل نہیں ہوں گے۔ جس کے لیے شہر سے گیس ماسک اور گیس سلنڈر منگوائے ہیں؟"

"یہ آخری کام ہم کل کریں گے اور اس کے بعد ہم بالکل فارغ ہوں گے۔"

"ہوں، اچھا اب یہ خبر بھی سن لیجیے کہ قاتل نے اس بار الماری سے صرف ایک خنجر نہیں چرایا، باقی ماندہ تین کے تین خنجر چرائے ہیں۔ ایک وہ آفاق شیرازی پر استعمال کر چکا ہے، دو ابھی اس کے پاس باقی ہیں، لہذا اس کے ارادے خطرناک ہیں، میں آپ دونوں کو محتاط رہنے کی نصیحت کرتا ہوں۔ آپ الگ الگ سوئیں اور دروازے اور کھڑکیاں اندر سے بند کر کے سوئیں۔"

"اوہ، تو بھوتوں کا پروگرام لمبا ہے۔" عابدہ سلطانہ نے پہلی مرتبہ خوف زدہ آواز میں کہا۔

"جی ہاں، اسی لیے تو میں اس بات پر زور دے رہا ہوں۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ ہم آپ کی ہدایات پر عمل کریں گے۔"

نواز خاطر نے کہا۔

" دوسرے یہ کہ ہم آپ کے کمرے کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔"

" وہ کس لیے ؟" نواز خاطر نے چونک کر کہا۔

" ہمیں یہ بھی تو دیکھنا ہے کہ خنجر کس نے چرائے ہیں۔ اس سے پہلے چرایا گیا خنجر تو لاش کے پیٹ میں ملا تھا۔ دوسرا خنجر آفاق کے سینے میں ملا ہے۔ لیکن تیسرا اور چوتھا خنجر تو ضرور قاتل کے پاس ہوں گے یا اس نے کہیں چھپا رکھے ہوں گے۔ اب اگر ہم دونوں خنجر تلاش کر لیں تو یہ بہت اچھی بات ہو گی۔"

" ہوں، بات تو ٹھیک ہے۔ پھر تو آپ تلاشی ضرور لیں۔" عابدہ سلطانہ نے فوراً کہا۔

انہوں نے اس کمرے کی تلاشی شروع کی۔ کمرے کی ہر چیز کو ٹھوک بجا کر دیکھا، لیکن خنجر کہیں نہ ملے۔ انہوں نے باری باری دوسرے کمروں کی تلاشی شروع کی۔ اس کام میں انہیں بہت دیر لگی، لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات کی صورت نکلا، کیونکہ پوری حویلی کے کمرے چھان مارنے کے بعد اور برآمدوں اور تمام کونوں کھدروں کو کھنگالنے کے بعد بھی دونوں خنجر انہیں کہیں نہ ملے۔ یہ ایک حیرت انگیز بات تھی۔ خود انسپکٹر جمشید کے چہرے پر حیرت کے آثار دیکھے جا سکتے تھے۔ شام کے کھانے پر انہوں نے نواز خاطر اور عابدہ سلطانہ کو بتایا:

" دونوں خنجر پوری حویلی میں کہیں نہیں مل سکے۔"

" اوہ، اب تو اس بات پر یقین کرنا ہی پڑے گا کہ یہ ساری کارستانی بھوتوں کی ہے۔" نواز خاطر بولا۔

" ہاں، اب تو مجھے بھی اس بات پر یقین آ گیا ہے۔ بھوتوں کے سوا یہ کام ہو بھی کس کا سکتا ہے، اگر کسی اور کا ہوتا تو ہم خنجر ضرور تلاش کر لیتے۔" انسپکٹر جمشید کے لہجے میں بلا کی مایوسی تھی۔ محمود، فاروق اور فرزانہ نے انہیں حیرت بھری نظروں سے دیکھا، جیسے کہہ رہے ہوں:

" ابا جان، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"

خوف ناک منظر

ان کے کمرے میں گہری خاموشی طاری تھی۔ چاروں گہری سوچ میں گم تھے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ ابھی تک اپنے والد کے جملے پر حیران تھے۔ تھوڑی دیر پہلے وہ نواز خاطر اور عابدہ کے پاس سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے آئے تھے اور اس وقت سے اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔

"نقشے پر بچھو کی موجودگی کی وجہ ابھی تک سمجھ میں نہیں آئی۔ کیا ڈبیا میں بچھو کسی خاص مقصد کے تحت لائے گئے ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا۔

"میرا تو یہ خیال ہے کہ یہ چاروں یہ سوچ کر چلے تھے کہ اگر خزانہ مل گیا تو وہ باقی تینوں کو ہلاک کر دے گا اور پورے خزانے کا تنہا مالک بن جائے گا، جان عالم اسی غرض کے لیے بچھو اپنے ساتھ لایا۔ اس نے پہلا بچھو ان میں سے ایک کے کمرے میں ڈال دیا، لیکن وہ رینگتا ہوا برآمدے میں آ گیا اور اس طرح جان عالم

کسی کو ہلاک نہ کر سکا۔ البتہ خود کسی کے ہاتھوں ہلاک ہو گیا۔ دوسرے نمبر پر آفاق شیرازی مارا گیا۔ دیکھنا یہ ہے کہ اب صبح سے پہلے کیا ہوتا ہے۔"

"تو پھر کیوں نہ ہم صبح تک کے لیے اپنے ذہنوں کو آزاد چھوڑ دیں اور گہری نیند کے مزے لیں۔" فاروق نے تجویز پیش کی۔

"تم ہمیشہ ایسی ہی ترکیبیں بتایا کرتے ہو۔ کبھی کوئی کام کی ترکیب بھی بتا دیا کرو۔" فرزانہ نے منہ بنایا۔

"اس کام کے لیے تم جو ہو۔"

"ان حالات میں میں بھی فاروق کی تجویز کی تائید کرتا ہوں۔" محمود بول پڑا۔

"ٹھیک ہے، ہم اب کر ہی کیا سکتے ہیں۔"

اور وہ سونے کے لیے لیٹ گئے۔ رات کے کسی حصے میں عجیب و غریب آوازوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ زور زور سے ڈھول پیٹے جا رہے تھے، جیسے برآمدوں میں کوئی جنگی جشن منایا جا رہا ہو۔ سب سے پہلے فرزانہ کی آنکھ کھلی، پھر انسپکٹر جمشید ہڑبڑا کر اٹھے۔ ان کے بعد محمود نے آنکھیں کھولیں۔ تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر ان کی نظریں فاروق کی طرف گئیں۔ فاروق ابھی تک سو رہا تھا۔

"ذرا فاروق کو تو دیکھیں، جیسے گھوڑے بیچ کر سویا ہو۔" فرزانہ نے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے، تم سوتے میں مجھ سے گھوڑے خریدتی رہی ہو۔" فاروق نے اچانک آنکھ کھول کر کہا۔

"آپس میں باتیں بگھارنے کی بجائے پہلے برآمدوں کی خبر لے لو۔" انسپکٹر جمشید نے بھنا کر کہا اور پھر دروازہ کھولتے ہوئے باہر نکل گئے۔ وہ بھی دوڑ کر ان تک پہنچے، لیکن برآمدوں میں تو کچھ بھی نہیں تھا، بس خالی آوازیں گونج رہی تھیں۔ آوازوں کی دھمک انہیں اپنے روئیں روئیں میں محسوس ہونے لگیں۔ ان کے دل تیز تیز دھڑکنے لگے۔ پھر انسپکٹر جمشید، نواز خاطر اور عابدہ سلطانہ کے کمروں کی طرف لپکے۔ ان کے دروازے اندر سے بند تھے۔ آوازیں یہاں بھی اسی طرح گونج رہی تھی۔ آخر انسپکٹر جمشید نے نواز خاطر کے دروازے پر زور زور سے دستک دینا شروع کی۔ ساتھ ہی انہوں نے کہا:

"محمود، تم عابدہ کے کمرے پر دستک دو۔"

"لیکن ابا جان، وہ تو ایک ہی کمرے میں...." وہ کہتے کہتے رک گیا۔

"شاید بعد میں وہ الگ الگ کمرے میں سوئے ہوں۔"

محمود عابدہ کے کمرے پر دستک دینے لگا، لیکن نہ تو نواز خاطر نے دروازہ کھولا اور نہ عابدہ نے۔ آخر انسپکٹر جمشید نے تنگ آ کر کہا:

"فاروق، فرزانہ، تم دونوں جا کر نواب صاحب کو بلا لاؤ۔"

"جی ہم جائیں۔" فاروق نے گھبرا کر کہا۔

"اور نہیں تو کیا تمہارے فرشتے جائیں گے، اتنے سے کام کے لیے۔" انسپکٹر جمشید تیز آواز میں بولے۔

"میری، میری طرف سے اجازت ہے۔ آپ انہی کو بھیج دیجیے۔" فاروق منمنایا۔

"تم جاتے ہو یا دوں ایک ہاتھ۔"

"شکریہ ابا جان، وہی کافی ہیں۔" اس نے کہا اور جلدی سے نواب صاحب کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ فرزانہ نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

وہ دونوں برابر دستک دیتے رہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے نواز خاطر اور عابدہ سلطانہ جاگتے ہوئے بھی خوف کی وجہ سے دروازے نہ کھول رہے ہوں۔ ادھر بے ہنگم شور بدستور جاری رہا۔ آخر تھوڑی دیر بعد نواب صاحب، ان کے بیٹے اور ملازم وہاں پہنچ گئے۔

"کیا معاملہ ہے جمشید؟" نواب صاحب بولے۔

"میں اس شور کی وجہ جاننا چاہتا ہوں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں، وہ کون سے بھوت پریت ہیں، جو اس حویلی میں گھس آئے ہیں، لیکن نواز خاطر اور عابدہ سلطانہ دروازے ہی نہیں کھول رہے۔"

"تو کیا آوازوں کا تعلق ان کے کمروں سے ہے؟"

"جی پتا نہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ آخر"

ان کے الفاظ درمیان میں ہی رہ گئے ـ عین اس وقت آوازیں یک لخت رک گئی تھیں ـ حویلی میں موت کی سی خاموشی طاری ہو گئی ـ انہوں نے حیران ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر دونوں کمروں کے دروازوں پر دستک دینے لگے ـ ایسے میں فاروق اور فرزانہ کو کمروں کی کھڑکیوں کا خیال آیا ـ اگرچہ انہیں یقین تھا کہ کھڑکیاں اندر سے بند ہوں گی، پھر بھی انہوں نے انہیں دیکھ لینا پسند کیا ـ جوں ہی فاروق نے کھڑکی کے پٹ دھکیلے، وہ کھل گئے ـ اس کے منہ سے نکلا:

"ارے، کمرے کی کھڑکی کھلی ہے"

"اور اس کمرے کی کھڑکی بھی کھلی ہے" فرزانہ بولی۔

فاروق نے اندر جھانکا ـ یہ کمرہ عابدہ سلطانہ کا تھا، لیکن اندر کوئی بھی نظر نہ آیا ـ ادھر فرزانہ نے اندر جھانکا اور پھر اس کے حلق سے ایک چیخ نکل گئی ـ اس کی چیخ نے دستکوں کا سلسلہ روک دیا۔ وہ سب اس کی طرف بڑھے اور پھر دھک سے رہ گئے ـ ان کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں، منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

کمرے کا منظر انتہائی خوف ناک تھا ـ

نواز خاطر اپنے بستر پر چت لیٹا ہوا تھا اور اس کے سینے میں خنجر دستے تک دھنسا ہوا تھا ـ بستر کی چادر خون سے تر ہو چکی تھی اور خون نیچے ٹپک رہا تھا ـ خون کے ٹپ ٹپ گرنے کی آواز انہیں پہلی مرتبہ آئی تھی ـ اس سے پہلے وہ دستکوں کے شور کی وجہ سے نہیں سن سکے تھے ـ اس سے کچھ فاصلے پر دوسری چارپائی تھی اور اس چارپائی کے سرہانے پر عابدہ سلطانہ کے سر کے بال صاف نظر آ رہے تھے ـ اس کے سینے میں بھی ایک خنجر پیوست تھا اور کم از کم انہیں ایسا منظر دیکھنے کی ایک فی صد بھی امید نہیں تھی ـ اس کی تو امید انہیں ضرور تھی کہ ان دونوں میں سے ایک کہیں ختم نہ کر دیا جائے، لیکن دونوں کے ہلاک کر دیے جانے کے بارے میں تو انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا۔

"اف خدا! یہ تو دونوں ہی ہلاک کیے جا چکے ہیں" فرزانہ کے منہ سے نکلا۔

"ہاں، لیکن انہیں کس نے ہلاک کیا ـ اس وقت تو ہم یہی سمجھتے رہے ہیں کہ چاروں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں اور کوئی ایک باقیوں پر ہاتھ صاف کرتا جا رہا ہے، لیکن ان دونوں کے مرنے کی صورت میں اب ہم کیا خیال قائم کریں گے" محمود نے پریشان لہجے میں کہا ـ

"پہلے تو کمرے کا دروازہ کھولا جائے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

محمود کھڑکی کے ذریعے اندر پھلانگ گیا اور دروازہ کھول دیا۔

وہ اندر داخل ہوئے۔ انسپکٹر جمشید نے دونوں کو چھو کر دیکھا۔ وہ دونوں مر چکے تھے اور انہیں مرے ہوئے ان کے اندازے کے مطابق کم از کم ایک گھنٹا تو ضرور ہی گزر چکا تھا؛ گویا ان کے مرنے کے ایک گھنٹا بعد بھوتوں کا پروگرام شروع ہوا تھا۔

"نواب صاحب، یہ صورتِ حال تو انتہائی چکرا دینے والی ہے۔" انسپکٹر جمشید بے چارگی کے عالم میں بولے۔

"تت، تو کیا یہ واقعی بھوتوں کا کام ہے۔ ان چاروں کو بھوتوں نے ہلاک کیا ہے؟"

"اگر انہیں بھوتوں نے ہلاک نہیں کیا ہے تو پھر کس نے کیا ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے عابدہ سلطانہ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کا سارا چہرہ بالوں سے ڈھک گیا تھا۔ جوں ہی انہوں نے اس کے چہرے سے بال ہٹائے، دہشت زدہ انداز میں لڑکھڑا کر پیچھے ہٹے۔ ان کے بدن پر کپکپی طاری ہوگئی۔ عابدہ سلطانہ کے چہرے کا گوشت جھڑ گیا تھا اور چہرے کے آس پاس کی جگہ سے بستر جھلسا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ بستر کی سفید چادر پر خون سے کسی نے یہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ لکھ دیے تھے:

"راجہ رومان چند کی روح کبھی کسی کو اس خزانے تک نہیں

پہنچنے دے گی، جو بھی ایسی کوشش کرے گا۔ اس کا انجام ایسا ہی بھیانک ہوگا۔"

انہوں نے عابدہ سلطانہ کے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو دیکھا۔ شہادت والی انگلی خون میں ڈوبی ہوئی تھی؛ گویا یہ الفاظ اس نے اپنے خون سے لکھے تھے۔

"یا اللہ رحم، یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں۔" نواب صاحب نے تھر تھر کانپتی آواز میں کہا۔

"اس کا مطلب ہے، برآمدوں میں دھما چوکڑی رومان چند کی روح مچاتی رہی ہے۔" نواب صاحب کے بیٹے نصرالدین نے کہا۔

"اس کے علاوہ اب اور کیا کہا جا سکتا ہے۔" اس کے بھائی شاکرالدین نے جواب میں کہا۔

"لیکن سوال یہ ہے کہ چہرے کے آس پاس سے بستر کیوں جھلسا ہوا ہے۔ نواز خاطر کے چہرے کا گوشت کیوں نہیں جھڑا۔ آخر وہ کیا چیز تھی، جس نے گوشت کو غائب کر دیا۔" انسپکٹر جمشید نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا۔

"دوسرے یہ کہ اگر یہ کام کسی روح کا ہے، تو روح کو خنجر استعمال کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ روح تو ایسے کام بغیر خنجر کے بھی کر سکتی ہے۔" محمود نے کہا۔

"ہاں، اسی لیے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ روح اور بھوت پریت

کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ قاتل نے یہ ثابت کرنے کی پوری
کوشش کی ہے کہ یہ معاملہ بھوتوں سے تعلق رکھتا ہے، یہاں تک کہ قاتل
نے عابدہ کی انگلی اسی کے خون میں ڈبو کر یہ الفاظ بھی لکھے ہیں۔
اس سے پہلے ہم یہی خیال کرتے رہے کہ ان چاروں میں سے ایک
قاتل ہے، لیکن اب جب کہ چاروں کے چاروں ہلاک کر دیے گئے ہیں،
ہم یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ قاتل کوئی اور ہے۔ کیوں نواب انکل،
آپ کا کیا خیال ہے؟" یہ کہتے وقت ان کی نظریں نواب صاحب کے
چہرے پر جم گئیں۔

"ہم، میں کیا کہہ سکتا ہوں جمشید۔ ایسے معاملات کے ماہر تو
تم ہو۔ اسی لیے تو میں نے تمہیں بلایا تھا۔" نواب صاحب نے ہکلا
کر کہا۔

"اور آپ نے اچھا ہی کیا؛ ورنہ آج اس معاملے کو بھوتوں کا
معاملہ کہہ کر ختم کر دیا جاتا۔" وہ بولے۔

"لیکن اب تم کیا کروگے؟" نواب صاحب کے لہجے میں حیرت تھی۔

"بس، سب سے پہلے تو آپ جہان خان کو فون کیجیے اور ساتھ
ہی ان لوگوں کی ملازمہ سراکی کو بلائیے۔ اسی بھی حالات کی خبر کرنی
چاہیے۔"

"اچھی بات ہے۔" یہ کہہ کر خان صاحب کو فون کرنے چلے گئے۔
ساتھ ہی انھوں نے رحیم سے کہا کہ وہ سراکی کو بلا لائے۔

سراکی ان کے پاس اس حالت میں پہنچی کہ اس کے قدم نیند کی
وجہ سے ڈگمگا رہے تھے۔ چہرے پر گھبراہٹ کے آثار طاری تھے۔

"اف میرے اللہ، یہ کیا ہوا؟"

"یہ دونوں بھی چل بسے سراکی، اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟"

"میرا — میرا بھلا کیا پروگرام ہو سکتا ہے، پروگرام تو بڑے لوگوں
کے ہوتے ہیں۔" اس نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"میرا مطلب ہے، اب تم یہاں ٹھہرنا پسند کروگی، یا واپس
جانا؟"

"اب میرا یہاں کیا کام رہ گیا ہے۔ اگر مجھے جانے کی اجازت
ہو تو میں صبح ہی یہاں سے جا سکتی ہوں۔" اس نے کہا۔

"اتنی جلد تو خیر نہیں، آپ کو ایک آدھ دن تو اور ٹھہرنا
ہوگا۔ ہاں، ان لوگوں کے پاس آپ کب سے ملازم تھیں؟"

"کئی سال پہلے ملازمت اختیار کی تھی۔" اس نے دکھ بھرے لہجے
میں کہا۔

"ان لوگوں کے مشاغل کیا تھے؟"

"بس اسی قسم کے، کھنڈرات کی سیر کرنا، تحقیقات کرنا، اپنے
استاد پروفیسر ابرام سے مشورہ کرنا، ان سے ہدایات لینا۔"

"ہوں، کیا پروفیسر ابرام بھی ان سے ملنے کے لیے آیا کرتے
تھے یا صرف یہی ان کے ہاں جایا کرتے تھے۔"

"وہ بھی کبھی کبھار آجایا کرتے تھے، لیکن زیادہ تر یہی جایا کرتے تھے۔"

"کبھی آپ نے ان کے پاس نقشے کے چند ٹکڑے دیکھے تھے؟"

"جی ہاں، میں نے ان کے پاس چار ٹکڑے اکثر دیکھے ہیں۔ ہر ایک کے پاس ایک ایک ٹکڑا تھا۔ یہ اکثر انہیں میز پر رکھ کر ایک دوسرے سے ملا کر گھنٹوں اسے گھورا کرتے تھے۔"

"اوہ، کیا کہا، چار ٹکڑے۔" انسپکٹر جمشید کے منہ سے نکلا۔

"جی ہاں، چار ٹکڑے۔"

"لیکن یہاں تو صرف دو کے سامان سے ایک ایک ٹکڑا ملا ہے۔" محمود بولا۔

"اس سلسلے میں میں کیا کہہ سکتی ہوں۔"

"جان عالم کے سوٹ کیس سے صرف ایک ٹکڑا ملا تھا اور آفاق شیرازی کے سوٹ کیس سے بھی ایک ٹکڑا ملا تھا، لیکن نواز خاطر اور عابدہ کے سوٹ کیسوں سے کوئی ٹکڑا نہیں ملا، تو کیا انہوں نے اپنے ٹکڑے کہیں اور رکھے ہوئے ہیں۔" انسپکٹر جمشید کھوئے کھوئے لہجے میں بولے، پھر بے خیالی میں آگے بڑھے اور نواز خاطر کی جیبوں کو ٹٹولا، پھر اس کے جسم کو ٹٹولا۔ اچانک ان کے چہرے پر چونکنے کے آثار پیدا ہوئے۔ انہیں نواز خاطر کی کمر پر کوئی چیز بندھی ہوئی محسوس ہوئی۔ بے چینی کے عالم میں انہوں نے اس کی

قمیص ہٹادی۔ انہوں نے چمڑے کی ایک پیٹی اس کی کمر کے گرد کسی ہوئی تھی۔ انہوں نے پیٹی کو کھول ڈالا۔ اس کے خانوں کا جائزہ لیا تو اس میں سے ایک بالکل ویسا ہی ٹکڑا نکلا، جسے وہ پہلے دیکھ چکے تھے۔ گویا یہ تیسرا ٹکڑا تھا۔

"اس کا مطلب ہے، چوتھا ٹکڑا اس کے جسم کے گرد بندھا ہوا ہوگا۔" انسپکٹر جمشید نے کہا اور پھر سراکی کی طرف مڑے:

"آپ اس کی کمر کا جائزہ لیں۔"

سراکی لرزتی کانپتی آگے بڑھی۔ اس نے عابدہ کی کمر کو ٹٹولا اور پھر فوراً ہی کپکپاتی آواز میں بولی:

"ان کی کمر سے بھی کچھ بندھا ہے۔"

"ٹھیک ہے، ہم منہ دوسری طرف کیے لیتے ہیں۔ اسے کھول لیں۔"

تھوڑی دیر بعد نقشے کا چوتھا ٹکڑا بھی ان کے ہاتھ میں تھا؛ گویا نقشہ مکمل ہو گیا تھا، لیکن ابھی تک معاملہ ان کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ نواز خاطر اور عابدہ صبح سرنگ میں داخل ہونے کا پروگرام بنا چکے تھے، لیکن صبح سے پہلے ہی انہیں ہلاک کر دیا گیا تھا۔ پھر سوچ کر انسپکٹر جمشید بولے:

"گویا اب اس سرنگ میں ہمیں داخل ہونا پڑے گا۔"

"جی، کیا مطلب؟"

"شاید ان چاروں کو اسی لیے ہلاک کیا گیا ہے کہ یہ سرنگ میں داخل نہ ہو سکیں۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

وہ رہا بچھو

نقشے کے چاروں ٹکڑے میز پر بچھے ہوئے تھے۔ انسپکٹر جمشید نے انہیں آپس میں ملا دیا تھا اور وہ چاروں بہت دیر سے انہیں غور سے دیکھ رہے تھے — بعد میں ملنے والے دو ٹکڑوں میں سے ایک پر ایک سنہری بچھو اور بنا ہوا تھا — نواز خاطر کے کمرے میں جہان خان اپنے عملے کے ساتھ مصروف تھا — تھوڑی دیر بعد کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا:

"انتہائی حیرت انگیز — ان دونوں خنجروں کے دستوں پر بھی ویسے ہی نشانات ملے ہیں، یعنی غیر انسانی سے۔"

"اور پورے گھر میں کوئی دستانہ نہیں ملا؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی نہیں، کوشش کے باوجود ہم کوئی ایسا دستانہ تلاش نہیں کر سکے۔ میں تو کہتا ہوں کہ یہ ضرور کسی جن یا بھوت کا کام ہے۔ ایسی انگلیوں کے نشانات کسی انسان کے تو ہو ہی نہیں سکتے۔" وہ بولا۔

"لیکن آپ کسی جن یا بھوت کو گرفتار کس طرح کر سکیں گے؟"

"میں خود پریشان ہوں۔ میری زندگی میں کبھی اتنا خوفناک، ہولناک اور خطرناک کیس کبھی نہیں ہوا۔" جہان خان بولا۔

"خیر، آپ فکر نہ کریں، میں اس جن یا بھوت کو آپ کے حوالے کر کے ہی یہاں سے جاؤں گا۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"جی، کیا مطلب؟" اس نے چونک کر کہا اور پھر اس کی نظر میز پر بچھے ہوئے نقشے پر پڑی۔

"یہ، یہ کیا ہے؟" اس کے منہ سے نکلا۔

"یہ خزانے کا نقشہ ہے۔" وہ بولے۔

"خزانے کا نقشہ، میں سمجھا نہیں۔"

"اسے چار ٹکڑوں میں تقسیم کر کے ان چاروں نے ایک ایک ٹکڑا اپنے اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔ یہ چاروں دراصل اپنے گھروں سے رومان چند کے کھنڈرات میں دفن خزانے کی تلاش میں آئے تھے۔ آپ نے تو رومان چند کی تاریخ پر وہ کتاب پڑھی ہو گی جو آپ نے مجھے دی ہے۔"

"جی ہاں، میں نے وہ پڑھ رکھی ہے۔"

"تب پھر آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ رومان چند ایک بہت بڑا خزانہ ان کھنڈرات میں دفن کر کے مرا تھا۔"

"جی ہاں، میں جانتا ہوں۔"

"اور اس کا وزیر فرار ہو گیا تھا۔ وہ بھی خزانے کے راز سے واقف تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے یہ نقشہ بنا کر اپنی اولاد کے لیے چھوڑا تھا، تاکہ اگر انہیں موقع مل جائے تو خزانہ حاصل کر سکیں، پھر وقت گزرتا چلا گیا، اور یہ نقشہ نسل در نسل منتقل ہوتا رہا۔ کچھ عرصہ پہلے یہاں پروفیسر ابرام بھی آئے تھے۔ انہوں نے بھی بظاہر ان کھنڈرات کی تحقیقات کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن میرا خیال ہے کہ وہ بھی یہاں خزانے کی تلاش میں آئے تھے۔ انہوں نے بھی حویلی میں بطور مہمان قیام کیا تھا۔ نواب صاحب سے ان کے دوستانہ تعلقات بھی قائم ہو گئے تھے، لیکن وہ بھی خزانہ تلاش نہ کر سکے۔ اب بیس پچیس سال بعد پھر انہوں نے ان چاروں کو یہاں بھیجا تھا، لیکن ان چاروں کو ہلاک کر دیا گیا۔ ابھی تک ہم یہ بھی معلوم نہیں کر سکے کہ ہلاک کس نے کیا۔ اب ہم اس سرنگ کا جائزہ لینے جا رہے ہیں۔ اگر آپ بھی چلنا پسند کریں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔"

"میں آپ کے ساتھ ضرور چلوں گا، لیکن سرنگ میں ہرگز داخل نہیں ہوں گا۔" اس نے خوف سے تھر تھر کانپتی آواز میں کہا۔

"اس سرنگ کے دہانے تک تو پہلے ہی کئی لوگ پہنچ چکے ہیں۔ پروفیسر ابرام کے بارے میں کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ

سرنگ اس نے دریافت کی تھی، لیکن اس کے اندر وہ بھی داخل نہیں ہو سکا تھا۔" جہان خان نے نئی بات کہی۔

"کیا مطلب؟ آپ کو یہ بات کس طرح معلوم ہوئی، جب کہ نواب صاحب تک کو پروفیسر ابرام کی مہم کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔"

"بہت سے لوگوں نے پروفیسر ابرام کو کھنڈرات میں منڈلاتے دیکھا تھا۔ میرے والد اس زمانے میں یہاں کے ڈی ایس پی تھے۔ انہوں نے بہت سی افواہیں سنی تھیں، پھر پروفیسر ابرام کے لوٹ جانے کے بعد لوگوں نے بھی کھنڈرات کو کھنگالا تھا اور وہ سرنگ انہیں نظر آئی تھی۔۔۔ یہ بات مجھے میرے والد نے بتائی تھی اور میں اسے اس وقت سے سینے میں چھپائے چلا آ رہا ہوں۔۔۔ سچ بات تو یہ ہے کہ میں خود بھی اس سرنگ میں داخل ہونے کی کوشش کر چکا ہوں، لیکن دہانے میں داخل ہوتے ہی نہ جانے کیا ہو جاتا ہے، آگے بڑھنے کی ہمت جواب دے جاتی ہے۔"

"ہوں، تو یہ بات ہے۔۔۔ ان حالات میں تو ان چاروں کے قاتل آپ بھی ہو سکتے ہیں۔" فرزانہ کے منہ سے سوچے سمجھے بغیر نکلا۔

"کیا، نہیں۔" جہان خان بری طرح اچھل پڑا۔ اس کا رنگ سفید پڑ گیا۔ وہ کھا جانے والی نظروں سے فرزانہ کو گھورنے لگا۔۔۔

"فرزانہ کو اتنی تیز نظروں سے نہ دیکھیے جناب، اس نے جو کہا ہے، وہ ناممکن تو نہیں۔ کیا خبر آپ خزانے تک پہلے ہی پہنچ چکے ہوں اور ہر آنے والے کو خزانے تک پہنچنے سے پہلے ہی موت کے گھاٹ اتارنا پسند کرتے ہوں یا خوف زدہ کر کے بھگا دینا چاہتے ہوں۔ کیا خیال ہے، یہی بات ہے نا۔"

"ہرگز نہیں، یہ بات سوچی بھی نہیں جا سکتی۔" اس نے مضبوط لہجے میں کہا اور انکار میں سر بھی ہلایا۔

"خیر دیکھا جائے گا،" محمود، فاروق اور فرزانہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ "اب عمل کا وقت آ چکا ہے۔ سب سے پہلے ہمیں اس حویلی میں رات کے وقت پیدا ہونے والی آوازوں کا راز معلوم کرنا ہے۔ کیونکہ مجھے سو فی صد یقین ہے کہ وہ آوازیں بھوتوں یا جنوں کی نہیں ہوتیں، خود انسان کی پیدا کردہ ہیں۔"

"جی بہتر۔۔۔ ہم ابھی یہ کوشش شروع کر دیتے ہیں، لیکن آپ تو سرنگ کی طرف روانہ ہونے کی بات کر رہے تھے۔"

"وہاں ہم شام کو چلیں گے۔" انہوں نے کہا۔

اور انہوں نے حویلی کے برآمدوں کے چپے چپے کو ٹھوک بجا کر دیکھنا شروع کیا۔ ایک گھنٹے تک وہ اس عمل میں مصروف رہے، پھر تنگ آ گئے۔ مایوسی نے انہیں اپنی لپیٹ میں لینا شروع ہی کیا تھا کہ فرزانہ کی نظریں برآمدوں میں کھلنے والے روشن دانوں پر گئیں۔

اس نے چونک کر کہا:

"ابا جان، یہ روشن دان بہت اونچے ہیں۔ ہم نے ابھی تک انہیں چیک نہیں کیا۔ کیا خبر مائیک وغیرہ انہی میں سے چند ایک میں لگے ہوں۔"

"اوہ ہاں، واقعی۔ ٹھہرو میں رحیم اور کریم کے ذریعے سیڑھیاں منگوا لوں۔"

سیڑھیوں کے ذریعے روشن دانوں تک پہنچا گیا اور پھر تین روشن دانوں میں مائک لگے مل گئے۔ یہ تینوں روشندان عابدہ سلطانہ اور نواز خاطر کے کمروں کے ثابت ہوئے اور پھر ان روشن دانوں کی دیواروں کے ساتھ ساتھ چپکے ہوئے باریک تار بھی مل گئے، لیکن سوال یہ ہے کہ وہ ٹیپ ریکارڈر کہاں تھا، جس سے یہ لوگ آوازیں برآمدے میں پہنچاتے تھے۔ کیونکہ ان کے سامان میں نہ تو کوئی ٹیپ ریکارڈر ملا تھا اور نہ کوئی کیسٹ۔ اچانک محمود کی نظر نواز خاطر کے کمرے کی چھت سے لٹکے فانوس پر پڑی۔ اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"کیوں نہ اس فانوس کو دیکھ لیا جائے۔ کیا خبر وہ ٹیپ ریکارڈر اور کیسٹ اس میں چھپا کر رکھتے ہوں۔" وہ بڑبڑائی۔

"بات تو ٹھیک ہے، یہ فانوس زیادہ اونچا بھی نہیں ہے۔ ایک میز اور میز کے اوپر کرسی رکھ کر اس تک پہنچا جا سکتا ہے۔" محمود

نے جلدی سے کہا۔

اور پھر فانوس سے انہیں ٹیپ ریکارڈر اور کیسٹ بھی مل گئے۔ ایک مسئلہ حل ہو گیا۔ یہ بات ثابت ہو گئی کہ اس معاملے کا جنّوں اور بھوتوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ فاروق کو نہ جانے کیا خیال آیا۔ اس نے ٹیپ ریکارڈر کا وہ خانہ کھول ڈالا جس میں سیل لگائے جاتے ہیں۔ انہوں نے دیکھا، سیلوں کے اوپر ایک انسانی کھال کی رنگت کا ایک دستانہ ٹھونسا ہوا تھا۔ دستانے کو دیکھا گیا تو اس پر عجیب و غریب لکیریں بنی تھیں۔ یہی وہ لکیریں تھیں، جو انگلیوں کے نشانات کی صورت میں خنجروں پر پائی گئی تھیں، لیکن چونکہ یہ انسانی انگلیوں کے نشانات جیسی نہیں تھیں، اس لیے وہ غیر انسانی قرار دی جاتی رہی تھیں۔

"اتنا کچھ معلوم ہو جانے کے بعد بھی ہم ابھی تک یہ نہیں جان سکے کہ قاتل کون ہے اور اس نے یہ چار قتل کیوں کیے ہیں۔" محمود نے پریشان آواز میں کہا۔

"ہاں، یہ تو ہے۔ آؤ، ذرا اس سرنگ کی بھی خبر لے آئیں۔"

تھوڑی دیر بعد وہ سب سرنگ کا رخ کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ جہان خان کے علاوہ نواب صاحب بھی تھے۔ اس معاملے میں اب ان کی دل چسپی میں ہر لمحے اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔

انسپکٹر جمشید ایک طاقت ور ٹارچ ساتھ لائے تھے۔ انھوں نے گیس ماسک پہنا، گیس کا سلنڈر بھی کمر پر لادا اور پائپ منہ میں دبایا، پھر سب کے سب گڑھے میں اترے۔ آسمان پر سورج چمک رہا تھا، لیکن سرنگ کے اندر تو اندھیرا ہی ہو سکتا تھا۔ دہانے پر پہنچ کر انھوں نے باقی سب لوگوں وہیں ٹھہرنے کا اشارا کیا اور خود اندر رینگ گئے۔ دہانے پر کھڑے لوگوں کے دل دھک دھک کرنے لگے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد ان کی واپسی ہوئی۔ ان کے کپڑے بالکل خراب ہو چکے تھے۔ باہر نکل کر سیدھے کھڑے ہوتے ہوئے انھوں نے کہا:

"یہ سرنگ دھوکے کی ٹٹی ہے۔"

"دھوکے کی ٹٹی، کیا مطلب؟" فرزانہ بولی۔ سب چونک کر انہیں دیکھنے لگے۔

"راجہ نے یہ سرنگ ہنگامی حالات کے لیے بنائی تھی، تاکہ کبھی کوئی راجہ اس پر حملہ کر دے تو شکست کی صورت میں اس کے ذریعے فرار ہو سکے۔ یہ بہت دور گھنے جنگل میں نکلتی ہے۔ اس زمانے میں اس کے دوسرے دہانے کے گرد گھنی جھاڑیاں رہی ہوں گی۔"

"گویا اس سرنگ کا خزانے سے کوئی تعلق نہیں۔" محمود بولا۔

"نہیں، اسی لیے میں نے کہا تھا کہ یہ سرنگ دھوکے کی ٹٹی ہے۔ عابدہ سلطانہ کے ساتھی دکھاوے کے طور پر یہاں کام کرتے رہے ہیں۔ خزانے کی تلاش کا کام خفیہ طور پر انھوں نے کہیں اور جاری رکھا ہوگا۔ ہمیں اس جگہ کو تلاش کرنا ہوگا، لہذا اب ضرورت پڑتی ہے اس نقشے کی۔ آئیے گڑھے سے باہر نکل کر نقشے کا جائزہ لیں۔"

پہلی مرتبہ انھوں نے نقشے کی ایک ایک لکیر، تیر کے ایک ایک نشان اور دائروں وغیرہ کو دیکھا۔ نقشے کے ایک کونے میں سورج بھی بنا ہوا تھا اور اس پر بارہ کا ہندسہ لکھا گیا تھا۔ اس کے ٹھیک نیچے کی طرف ایک تیر کا اشارا تھا اور اس تیر کے نیچے ہی وہ سنہری بچھو بنا ہوا تھا۔ اس سے دائیں طرف ایک اور تیر اشارا کر رہا تھا۔ اس تیر کے بالکل سامنے دوسرے کونے میں دوسرا بچھو تھا۔ انسپکٹر جمشید نے گھڑی پر نظر ڈالی تو بارہ بجنے میں ابھی تقریباً بیس منٹ باقی تھے۔

"میرا خیال ہے، ہمیں بارہ بجے کے قریب اس نقشے کے مطابق کھنڈرات کا جائزہ لینا ہوگا۔"

"کیا آپ کا خیال یہ ہے کہ ہم خزانے تک آسانی سے پہنچ جائیں گے۔" فاروق بولا۔

"نہیں، جس خزانے کے لیے اتنے بہت سے لوگوں نے کوشش

کی اور ناکام رہے۔ بھلا اس خزانے کو ہم اتنی آسانی سے کس
طرح تلاش کر سکتے ہیں؛ بہر حال ہم کوشش تو ضرور کریں گے۔"

"ہم نے آپ کو پہلے کبھی خزانوں میں دلچسپی لیتے نہیں
دیکھا۔" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"میں اب بھی دلچسپی نہیں لے رہا ہوں، لیکن چونکہ اس
چکر میں چار آدمی اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں، اس لیے
معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرنا بھی میرا فرض ہے اور اگر
اس طرح لگے ہاتھوں خزانہ بھی ہاتھ لگ جائے تو یہ بھی کوئی بُری
بات نہیں ہو گی۔"

بارہ بجتے ہی انہوں نے چاروں طرف سے کھنڈرات کا جائزہ
لیا۔ سورج اس وقت ان کے عین سروں پر چمک رہا تھا۔ کھنڈرات
اس وقت بھی حد درجے پراسرار لگ رہے تھے۔ انسپکٹر جمشید بہت
تیزی سے ادھر ادھر گئے۔ بھاگ بھاگ کر ادھر سے ادھر پہنچے، لیکن ان
کی کوشش بارآور ثابت نہ ہوئی۔

"آخر آپ کس چیز کی تلاش میں ہیں۔" فرزانہ نے بے چین
ہو کر پوچھا۔

"بچھو کی۔"

"جی، بچھو کی تلاش میں، لیکن بچھوؤں کی ڈبیا تو پہلے ہی ہمارے
پاس موجود ہے۔" فاروق بولا۔

"یار، میں اس نقشے والے بچھوؤں کی بات کر رہا ہوں۔ آخر
اس نقشے پر بچھو کیوں بنے ہیں۔" انہوں نے جھنجھلا کر کہا۔

"یہ تو نقشہ بنانے والا ہی بتا سکتا ہے، لیکن وہ تو اب
زندہ نہیں ہو گا۔" فاروق نے مسمسی صورت بنا کر کہا۔

"دھت تیرے کی۔ تم ایسے میں بھی باز نہیں آتے۔" محمود
نے جھلا کر اپنی ران پر ہاتھ مارا۔

کئی گھنٹے کی بھاگ دوڑ کے بعد بھی وہ کوئی سراغ نہ لگا سکے۔
آخر تھک ہار کر واپس لوٹے۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم اس کیس کو حل کرنے میں
ناکام ہو جائیں گے۔" انسپکٹر جمشید عجیب سے لہجے میں بولے۔

"یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ ایسا تو ہم کبھی سوچ بھی نہیں سکتے۔"
محمود نے بوکھلا کر کہا۔

"اس مرتبہ شاید ہم نے مشاہدے سے زیادہ کام نہیں لیا۔
دوسرے لفظوں میں آنکھیں کھلی نہیں رکھیں۔ ضرور ہم سے کوئی
بھول ہوئی ہے۔" وہ ٹھہری ہوئی آواز میں کہتے چلے گئے۔

"ابا جان، کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ خزانہ کھنڈرات کے نیچے
دفن ہونے کی بجائے محل کے نیچے کہیں دفن ہو۔" اچانک فرزانہ
نے کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ چونکے۔

"راجہ کو تو اسی وقت ہلاک کر دیا گیا تھا۔ وزیر فرار ہو گیا تھا۔
کیا اس نے بعد میں خزانہ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی ہوگی۔
کہیں ایسا تو نہیں کہ اس نے خزانہ محل کے نیچے سے نکال کر
اس حویلی کے نیچے کہیں چھپا دیا ہو اور یہ نقشہ اس نے اپنی اولاد
کے لیے بنایا ہو۔"

"اوہ، خدا کی قسم، ایسا عین ممکن ہے۔" وہ پرجوش انداز
میں بولے، "شاید اس حویلی کے نیچے بھی کوئی خفیہ جگہ موجود ہو۔"

"اور لوگوں میں یہ مشہور ہو گیا ہو کہ خزانہ کھنڈرات کے نیچے
ہی کہیں ہے۔ شاید اسی لیے آج تک کوئی اس خزانے تک نہیں
پہنچ سکا۔" فرزانہ پر جوش کی عجیب سی کیفیت طاری تھی۔

"تم ٹھیک کہتی ہو فرزانہ، میرا دل تمہاری باتوں کو تسلیم کر رہا
ہے۔ جلدی کرو، ہمیں فوراً حویلی پہنچ کر نقشے کی مدد سے جائزہ
لینا ہے۔"

"لیکن اب دوپہر کے بارہ بجے کافی دیر گزر چکی ہے۔ میرا خیال
ہے، آپ کل دوپہر بارہ بجے ہی یہ تجربہ کر سکیں گے۔"

"اچھا تو پھر کل دوپہر تک اس موضوع پر کسی اور آدمی سے
بات نہیں کرنا ہے۔" انہوں نے پراسرار لہجے میں کہا اور خاموش ہو گئے۔

دوسرے دن بارہ بجنے سے چند منٹ پہلے وہ تیار ہو کر اپنے
کمرے سے نکلے ۔۔۔ انسپکٹر جمشید رات گئے تک نقشے پر غور کرتے

رہے تھے۔

"ہمیں چھت پر جانا ہوگا۔"

"چھت پر؟ لیکن ابا جان، خزانے تو نیچے زمین میں دفن
کیے جاتے ہیں۔" فاروق بولا۔

"زمین میں، اس جگہ کی تلاش کے سلسلے میں ہی میں چھت پر
جا رہا ہوں ۔۔۔ تم لوگ بھی آؤ۔"

چاروں اوپر پہنچے ۔۔۔ اسی وقت بارہ بج گئے۔ انسپکٹر جمشید نے
بے تابی کے عالم میں چاروں طرف دیکھنا شروع کیا۔ اچانک ان کے
منہ سے نکلا:

"وہ رہا، بچھو۔"

مجرم کون؟

انہوں نے چونک کر اس سمت میں دیکھا، جس طرف انہوں نے اشارا کیا تھا۔ انہوں نے دیکھا، چھت کے فرش پر ایک جگہ سنہری رنگ کا بچھو بنا ہوا تھا۔ یہ کسی عجیب و غریب رنگ سے بنا ہوا تھا۔ وہ اس کے پاس جاکر کھڑے ہوگئے۔ حیرت اور جوش نے ان کی حالت عجیب بنا دی تھی۔ چند لمحے اس بچھو کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے رہے۔ اور پھر اچانک بچھو غائب ہوگیا۔

"ارے بچھو کہاں گیا؟"

"یہی تو کمال ہے، یہ کسی ایسی روشنائی یا رنگ سے بنایا گیا ہے، جو بالکل سیدھی شعاعیں پڑنے پر نظر آتا ہے اور وہ بھی چند سیکنڈ کے لیے۔ جوں ہی سورج کی شعاعیں ذرا ترچھی ہوتی ہیں، نظر آنا بند ہو جاتا ہے۔ اب یہاں سے دائیں طرف ایک تیر اشارا کر رہا ہے۔ آؤ دائیں طرف چلو۔" انہوں نے کہا۔

چھت کے دوسرے سرے پر پہنچ کر انہوں نے چھت کو دیکھا۔

اس جگہ انہیں دوسرا بچھو بھی نظر آگیا، لیکن فوراً ہی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ اس جگہ سے ایک تیر عمودی صورت میں نیچے کی طرف اشارا کر رہا تھا۔ اس وقت وہ چھت کی منڈیر کے ساتھ تھے۔ انہوں نے نیچے جھانک کر دیکھا۔ فوراً ہی انہیں معلوم ہوگیا۔ اس وقت وہ اس کمرے کے اوپر تھے جو عابدہ سلطانہ کو دیا گیا تھا۔ وہ نیچے اترے اور دروازے کو دھکیل کر اندر داخل ہوگئے۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ خزانے کا راستہ اس کمرے سے ہی نکلے گا۔ کمال ہے، شاید یہ لوگ خزانے کا کوئی سراغ نہیں لگا سکے۔ لیکن پھر انہیں قتل کیوں کر دیا گیا، ایسا کس نے کیا۔" وہ سوچ کے انداز میں بڑبڑائے۔

عابدہ سلطانہ کا کمرہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ انہوں نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ نقشہ برابر ان کی نظروں کے سامنے تھا۔ تیروں کا رخ اب کمرے کے آتشدان کی طرف تھا، آتش دان میں راکھ بھری تھی۔ انسپکٹر جمشید کے اشارے پر محمود، فاروق اور فرزانہ نے راکھ ہٹانا شروع کی۔ جلد ہی انہیں لوہے کی چادر نظر آنے لگی۔ اس چادر میں چاروں کونوں پر چار ابھری ہوئی کیلیں لگی تھیں۔ انہوں نے ان کیلوں کو پکڑ کر لوہے کی چادر اوپر اٹھانے کی کوشش کی، لیکن چادر ٹس سے مس نہ ہوئی، پھر انہوں نے کیلوں کو دبا کر دیکھا، لیکن کچھ نہ بنا۔

"ٹھہرو بھئی، یہ مسئلہ بھی نقشے کی مدد سے حل ہوگا۔" یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید بیٹھ گئے۔ نقشے پر لکھے ہندسوں کو دیکھ دیکھ کر انہوں نے پہلے ایک کیل کو ایک بار دبایا، وہ دب گیا۔ دوسرے کو دو بار دبایا، وہ بھی دب گیا۔ تیسرے کو تین بار دبایا، وہ بھی دب گیا۔ اور جب انہوں نے چوتھے کیل کو چار مرتبہ دبایا تو لوہے کی چادر کسی صندوق کے ڈھکنے کی طرح اوپر اٹھ گئی اور مزے کی بات یہ کہ ذرا سی راکھ بھی نیچے نہیں گری۔ تمام کی تمام راکھ ڈھکنے کے ساتھ ہی لگی رہ گئی تھی۔ انہوں نے دیکھا، سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔ لوہے کی چادر نے اٹھتے وقت بہت ہلکی سی آواز پیدا کی تھی۔

"لو بھئی، ہم خزانے تک پہنچ گئے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ابھی یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے ابا جان۔" فرزانہ بے چینی کے عالم میں بولی۔

"ہاتھ کنگن کو آرسی کیا، آؤ دیکھ لیتے ہیں۔" یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید سیڑھیاں اترنے لگے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ اس وقت ان کے ساتھ کوئی اور نہیں تھا۔ انہیں کافی گہرائی میں جانا پڑا۔ یہاں تک کہ آخری سیڑھی سے اتر کر فرش پر پہنچ گئے۔ اس کے ساتھ ہی لوہے کی چادر خود بخود گر گئی؛ گویا خفیہ راستہ بند ہو گیا تھا۔ تہہ خانے میں گھپ اندھیرا ہو گیا۔ انسپکٹر جمشید نے ٹارچ روشن کر لی اور اب جو انہوں نے ٹارچ کی روشنی چاروں

طرف ڈالی۔ ان کی آنکھیں خوف، دہشت اور حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ہر طرف سونے چاندی اور ہیرے جواہرات کے ڈھیر لگے تھے۔ ان کے درمیان ٹارچ کی روشنی میں انہیں عجیب سا احساس ہوا، جیسے وہ ہزاروں سال پرانے کسی مقبرے کے اندر پہنچ گئے ہوں۔ ساتھ ہی انہیں محسوس ہوا، اندر کچھ گھٹن سی تھی۔

"شاید ہوا کی آمدورفت کا تہہ خانے میں کوئی بندوبست نہیں کیا گیا۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے: "اگر ہم جلد ہی باہر نہ نکل گئے تو کہیں دم گھٹ کر نہ مر جائیں، آؤ اوپر چلیں۔"

اسی وقت فرزانہ چونکی۔ اس نے انسپکٹر جمشید کا شانہ پکڑتے ہوئے جلدی سے کہا۔

"ابا جان ٹارچ بجھا دیں، کسی نے لوہے کی چادر اوپر اٹھائی ہے۔"

اس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی ٹارچ بجھ گئی۔ تہہ خانے میں ہولناک تاریکی پھیل گئی۔ پھر انسپکٹر جمشید نے انہیں بازوؤں سے پکڑ کر سیڑھیوں کی طرف کھینچ لیا اور دیوار سے جا لگے۔ قدموں کی آواز تہہ خانے میں گونجنے لگی۔ کوئی ایک ایک سیڑھی نہایت آرام سے اتر رہا تھا۔ یوں لگتا تھا، جیسے اسے جلدی ذرا بھی نہ ہو اور پھر وہ فرش پر آ کھڑا ہوا۔ ساتھ ہی

دروازہ گر گیا۔ ٹارچ کی روشنی تہ خانے میں لہرائی اور انہوں نے
نیچے آنے والے کو صاف دیکھا۔ اسے دیکھ کر ان کی آنکھیں حیرت
سے پھیل گئیں۔ انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسا بھی ہو
سکتا ہے۔ خود انسپکٹر جمشید بھی حیرت کا بت بنے اسے دیکھ رہے
تھے۔ اسی وقت انہوں نے آنے والے کو پرمسرت آواز میں
کہتے سنا:

"اب دولت کا یہ انبار میرا ہے۔ میرے سوا کوئی اس
کا مالک نہیں، کوئی اس میں میرا حصے دار نہیں۔ میں تنہا مالک
ہوں۔"

اس کے الفاظ تہ خانے میں گونج اٹھے۔ دیواروں نے اس
کے الفاظ کو دہرایا۔ انہیں یوں لگا جیسے تہ خانے کی دیواریں
اس پر ہنس رہی ہوں، قہقہے لگا رہی ہوں۔ اسی وقت انسپکٹر
جمشید نے بھی اپنی ٹارچ روشن کر دی۔ ساتھ ہی ان کے منہ
سے نکلا:

"ہیلو سراکی۔"

وہ بوکھلا کر مڑی۔ انہوں نے دیکھا، اس کے ہاتھ میں ایک
پستول تھا اور اس کا رُخ ان کی طرف تھا۔ آنکھوں میں خوف بھی
تھا اور غصہ بھی۔

"مجھے تم لوگوں کے یہاں پہنچ جانے کی ایک فیصد بھی اُمید

نہیں تھی۔" سراکی نے سرسراتی آواز میں کہا۔

"بس دیکھ لو، لوگ ہمیں ایسے کاموں کا ماہر بلاوجہ تو خیال
نہیں کرتے۔"

"میں نے اس خزانے کو حاصل کرنے کے لیے بہت محنت
کی ہے۔ میں کسی قیمت پر اس سے محروم ہونا پسند نہیں کروں
گی۔"

"ہاں، محنت تو واقعی کی ہے۔ آخر چار انسانوں کو موت
کے گھاٹ اتارا ہے۔"

"یہ غلط ہے، جان عالم اور آفاق شیرازی کو نواز خاطر نے
ہلاک کیا تھا اور ایسا اس نے عابدہ کے کہنے پر کیا تھا۔ یہ چاروں
خزانہ چند روز پہلے تلاش کر چکے تھے اور منصوبے بنا رہے تھے کہ اب
اسے منتقل کیسے کیا جائے کہ عابدہ نے نواز خاطر کو پٹی پڑھائی، اگر
جان عالم اور آفاق شیرازی کو ختم کر دیا جائے تو یہ خزانہ صرف دو
آدمیوں میں تقسیم ہوگا۔ نواز خاطر کی بھی سمجھ میں یہ بات آگئی، لہذا
اس نے ان دونوں کو باری باری ٹھکانے لگا دیا۔ اس کے لیے وہ
دستانہ استعمال کیا گیا۔ دستانہ عابدہ اپنے ساتھ لائی تھی اور اس نے
نواز خاطر کو دیا تھا۔ شاید یہ پروگرام پہلے سے اس کے ذہن میں تھا۔
لیکن وہ دونوں یہ بھول گئے تھے کہ انہوں نے سوچے سمجھے بغیر ایک
ایسی عورت کو ملازم رکھ لیا ہے جو خود بھی آثار قدیمہ میں دلچسپی

رکھتی ہے اور خود کو ان پڑھ ظاہر کرتی ہے؛ حالانکہ کافی پڑھی لکھی ہے۔ میں شروع سے ان کی باتیں سننے کی کوشش کرتی رہی ہوں۔ اس خزانے کے بارے میں میں بھی اس وقت سے ہی سوچتی رہی ہوں، جب سے ان کی باتیں سننا شروع کی تھیں اور جب یہ چاروں خزانے تک پہنچ گئے تو میں بھی جان گئی کہ خزانہ کہاں ہے، پھر انہوں نے خود ہی اپنے دو ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ لہٰذا میرے لیے دو آدمیوں کو مارنا آسان تھا۔ نواز خاطر نے دوسری مرتبہ بھی صرف ایک خنجر چرایا تھا۔ اس کے بعد میں ہال میں داخل ہوئی اور میں نے باقی کے دو خنجر چرا لیے۔ ادھر نواز خاطر نے جب آپ لوگوں کی زبانی یہ سُنا کہ باقی کے دونوں خنجر غائب ہیں تو وہ فکرمند ہوگیا اور سوچنے لگا کہ کیا عابدہ اسے ختم کرنے کا پروگرام بنا چکی ہے۔ ادھر عابدہ بھی یہی سوچ رہی تھی، کہ کیا نواز خاطر اسے بھی ٹھکانے لگا دینا چاہتا ہے۔ دونوں بدگمان ضرور ہوگئے تھے۔ اور انہوں نے دل ہی دل میں جاگتے رہنے کا پروگرام بنایا تھا، لیکن ایسے میں میری بنائی ہوئی چائے کام کر گئی۔ سوتے وقت یہ دونوں چائے پینے کے عادی تھے۔ میں نے ان کے لیے چائے بنائی اور نیند والی گولیاں اس میں ملا دیں۔ چائے کافی تیز بنائی تھی۔ انہوں نے بھی چائے پیتے میں سوچا، چلو اچھا ہے۔ تیز چائے جاگنے میں مددگار ثابت ہوگی۔ دونوں چائے

پی گئے۔ میں نے جرم کا ثبوت وہاں نہیں رہنے دیا۔ دونوں کپ اٹھا کر باہر لے آئی اور اسی وقت دھو دیے۔ انہیں اتنا بھی وقت نہ مل سکا کہ دروازے ہی اندر سے بند کر سکیں؛ چنانچہ میں نہایت اطمینان سے رات کے وقت اندر داخل ہوئی اور خنجر ان کے سینوں میں اتار دیے، پھر عابدہ کے چہرے پر تیزاب بھی ڈال دیا۔ مطلب یہ تھا کہ یہ بھوتوں کی انتقامی کارروائی نظر آئے۔ یہ تھی کل کہانی۔" یہاں تک کہہ کر وہ خاموش ہوگئی۔

"لیکن اب تم اکیلی اس عظیم دولت کو کس طرح لے جا سکو گی؟"
انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"یہ کوئی مشکل نہیں، میں بے صبری نہیں ہوں۔ صبر کے ساتھ تھوڑا تھوڑا کرکے لے جاؤں گی۔" اس نے کہا۔

"لیکن تم حویلی میں داخل کس بہانے ہوا کرو گی؟"

"مجھے کسی بہانے کی ضرورت نہیں۔ میں نے نواب صاحب سے درخواست کی تھی کہ وہ مجھے ملازم رکھ لیں، کیونکہ ان چاروں کے ہلاک ہونے کے بعد اب مجھے پھر نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھاننا پڑے گی، لہٰذا انہوں نے مجھے ملازمت دے دی ہے۔"

"اوہو، اچھا۔" انسپکٹر جمشید حیران ہوکر بولے۔

"ہاں، اب تم لوگ مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ، کیونکہ تمہاری موجودگی میں میں اس خزانے کو حاصل کر ہی نہیں سکوں گی۔"

اس کا پستول والا ہاتھ تن گیا۔ وہ ایک ساتھ سب پر نظر رکھے ہوئے تھی۔

"تم بہت بڑی غلطی کر رہی ہو۔" انسپکٹر جمشید نے پرسکون انداز میں مسکرا کر کہا۔

"کیسی غلطی؟" وہ چونک اٹھی۔

"ہمیں مارنے کے بعد تم ہماری لاشوں کا کیا کرو گی۔ اگر تم نے ہمیں اس تہہ خانے میں رہنے دیا تو بدبو تمہیں اندر نہیں گھسنے دے گی اور اس طرح تم خزانے سے محروم ہو جاؤ گی۔"

"اوہ۔" اس نے پریشان ہو کر کہا۔

"اس مسئلے کا ایک آسان حل بھی ہے، اگر تم تیار ہو تو۔"

"کیسا حل؟"

"ہم اس خزانے میں سے اپنا حصہ لے کر یہاں سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ بعد میں تم خزانہ منتقل کرتی رہنا۔"

"اور باہر نکل کر تم پولیس کو بلا لو گے اور مجھے گرفتار کرا دو گے۔" اس نے فکرمند ہو کر کہا۔

"نہیں، کیونکہ اس طرح ہمیں اپنا حصہ بھی حکومت کے حوالے کرنا پڑے گا۔"

"اچھی بات ہے۔ تم لوگ اپنا حصہ لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔" اس نے گویا اپنا فیصلہ سنایا۔

وہ خزانے کی طرف قدم بڑھانے لگے۔ خزانے تک جانے کے لیے انہیں اس کے پاس سے گزرنا پڑا اور ایسے میں فرزانہ کا ہاتھ چل گیا۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر دُور جا گرا۔ سراکی پستول کی طرف جھپٹی، لیکن محمود کی ٹانگ چل گئی اور وہ اوندھے منہ گری۔ اُٹھ کر پھر پستول کی طرف بڑھی تو فاروق نے بال پکڑ کر ایک زوردار جھٹکا مارا اور وہ الٹ گئی۔ اتنی دیر میں پستول انسپکٹر جمشید اٹھا چکے تھے۔

"بس بھئی، تمہارا کھیل ختم ہو گیا۔ یہ سارا خزانہ حکومت کی تحویل میں دیا جائے گا۔ ہمارے ملک کو اس کی بہت شدید ضرورت ہے۔ اس خزانے سے ملک کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں بہت مدد ملے گی۔" انسپکٹر جمشید کی مسکراتی آواز تہہ خانے میں گونجنے لگی۔

"جاؤ محمود، اوپر سے سب کو بلا لاؤ اور ایک آدمی کو آخری سیڑھی پر کھڑے ہو جانا چاہیے تاکہ ہوا اندر آتی رہے۔"

تھوڑی دیر بعد سب لوگ پھٹی پھٹی آنکھوں سے تہہ خانے میں موجود دولت کے انبار کو دیکھ رہے تھے اور فاروق ان سے کہہ رہا تھا:

"حضرات آنکھوں کو اتنا نہ پھاڑیے کہ یہ بند ہونا ہی بھول جائیں اور آپ سونے سے محروم ہو جائیں۔ سُنا ہے سونا اس دنیا کی سب سے بڑی دولت ہے۔ سونا سے میرا مطلب نیند ہے،"

سونا دھات نہیں — اور ہاں، نواب دادا، ہمارا بھی سلام قبول کیجیے
اب آپ کے بھتیجے ہمیں یہاں ایک پل بھی نہیں ٹکنے دیں گے۔ یوں
اگر کیس ابھی دس دن بھی حل نہ ہوتا تو یہ یہیں رہتے، لیکن اب
نہیں رکیں گے، جی ہاں، ہم جانتے ہیں۔"

وہ کہتا چلا گیا اور چہروں پر مسکراہٹیں پھیلتی چلی گئیں۔

"ہم پیتل کے اس بچھو کو تو بھول ہی گئے۔ آخر اس کا اس
سارے معاملے سے کیا تعلق تھا۔"

"جس طرح اس سارے معاملے کا تعلق اس سرنگ سے کوئی
نہیں تھا۔ اسی طرح اس بچھو سے بھی کوئی تعلق نہیں تھا۔ ہو سکتا
ہے، ہمارے مجرم نے اسے الجھاؤ پیدا کرنے کے لیے ڈال دیا ہو۔"

"ضرور یہی بات ہوگی۔ آئیے اب چلیں یہاں سے، میرا دم
گھٹ رہا ہے — یوں لگتا ہے جیسے دیواریں ہمیں کھا جانے والی
نظروں سے گھور رہی ہوں اور کہہ رہی ہوں:

'بھاگ جاؤ یہاں سے، ہم سے ہمارا خزانہ نہ چھینو۔ تمہارا اس
خزانے پر کیا حق — یہ ہمارا ہے، ہمارا ہے، ہمارا ہے۔" فاروق
کہتا چلا گیا۔

"ریکارڈ پر سوئی اٹک گئی۔ محمود، اس کے سر پر ایک ہاتھ
جماؤ۔" فرزانہ نے مشورہ دیا۔

"کیوں تمہارے ہاتھوں کو کیا ہوا؟" محمود نے منہ بنایا۔

"میں بلا وجہ اپنے ہاتھوں کو تھکانے کی عادی نہیں۔" فرزانہ
نے تنک کر کہا۔

"لیکن بلا وجہ زبان کو تھکا رہی ہو۔" فاروق پھاڑ کھانے والے
لہجے میں بولا۔

"ارے ارے، ابا جان، جلدی باہر چلیے — معلوم ہوتا ہے،
تہ خانے کی بند فضا اس پر اثر انداز ہو رہی ہے — کہیں یہ
پاگل نہ ہو جائے۔"

یہ کہتے ہی فرزانہ نے بوکھلا کر سیڑھیوں کی طرف دوڑ لگا دی۔
اور فاروق اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھنے لگا۔

آئندہ ناول کی ایک جھلک

پانچواں عظیم الشان خاص نمبر (۱)

محمود، فاروق، فرزانہ، انسپکٹر جمشید اور

آفتاب، آصف، فرحت، انسپکٹر کامران مرزا

کا مشترکہ کارنامہ

پُراسرار اغوا

مصنف : اشتیاق احمد

- ایک ہول ناک مجرم کا خوف ناک منصوبہ۔
- کردار اس کی انگلیوں پر ناچنے پر مجبور ہو گئے
- وہ یہ بات کسی طرح نہ جان سکے کہ ان کا چالاک دشمن چاہتا کیا ہے۔

- انسپکٹر جمشید پارٹی عمودی پہاڑوں میں گھری ایک وادی میں قید کر دی گئی۔
- انہیں چیلنج کیا گیا کہ اس وادی میں وہ تین دن زندہ رہ کر دکھائیں ۔۔۔ یا باہر نکل کر۔۔۔
- کیا وہ زندہ رہے، یا باہر نکلنے میں کامیاب ہوئے؟
- انسپکٹر کامران مرزا نے اپنے جسم کو دیکھا تو ان کا رنگ توے کی طرح کالا ہو چکا تھا۔
- وہ ایک چٹیل میدان میں تیروں کی جنگ لڑتے ہیں، لیکن یہ جنگ انہوں نے کس کے خلاف لڑی؟ آپ پڑھ کر حیران رہ جائیں گے۔۔۔
- یہ ناول آخر تک آپ کے لیے ایک سوالیہ نشان بنا رہے گا اور آخر میں بھی آپ سوالیہ نشان کا مطلب نہیں سمجھ پائیں گے ۔۔۔ اور اگلا حصہ پڑھنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

قیمت : ۵/۵۰

مکتبہ اشتیاق، راجپوت مارکیٹ اردو بازار لاہور